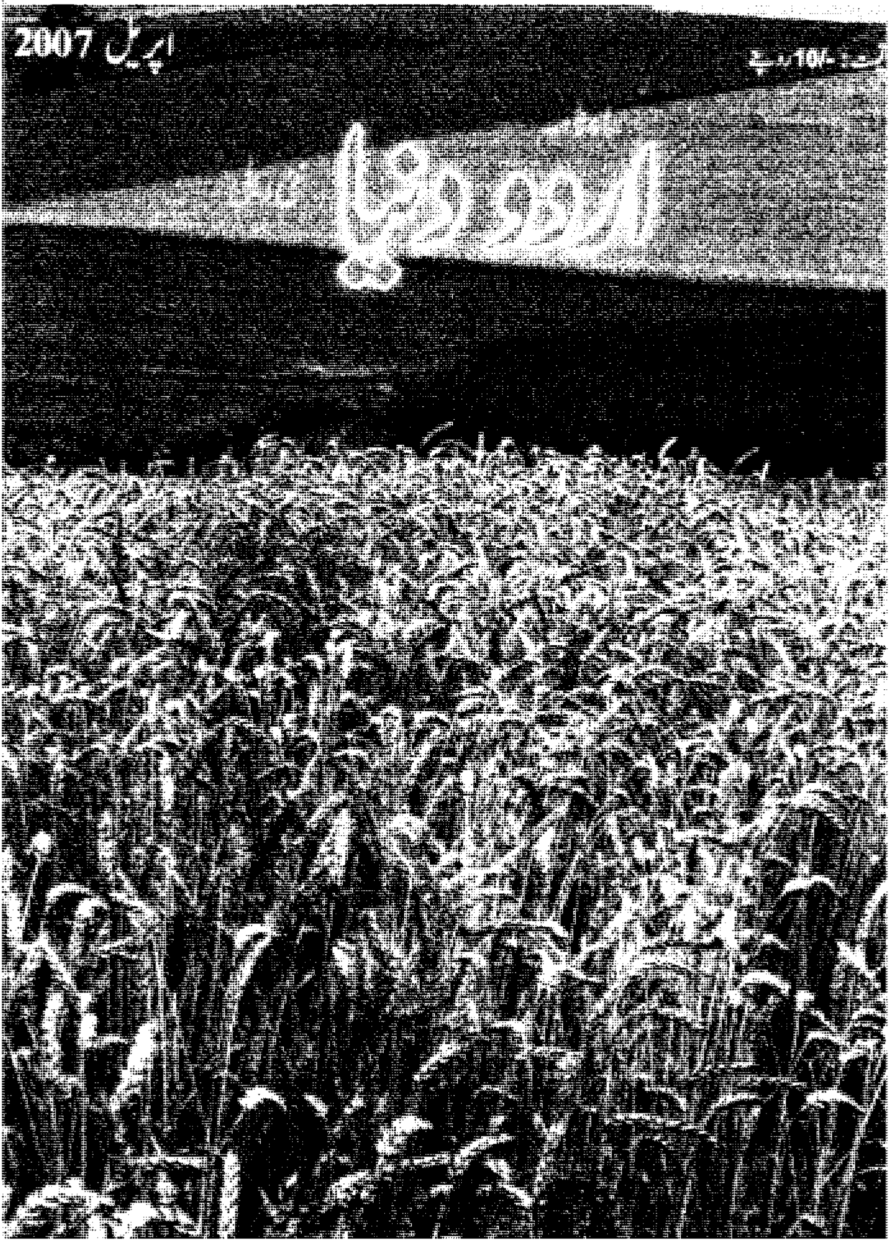
اپریل 2007
10/-
اردو دنیا

این سی. پی. یو. ایل. ایگزیکٹو بورڈ کی چوبیسویں سالانہ نشست 15 مارچ 2007 کو انڈیا اسلامک سینٹر، نئی دہلی کے کانفرنس ہال نمبر۔ 1 میں ہوئی جس کی صدارت این سی. پی. یو. ایل. کے وائس چیئر مین جناب شمس الرحمن فاروقی نے کی۔ تصویر میں فاروقی صاحب کے علاوہ محترمہ رشمی چودھری، ڈائرکٹر انچارج این سی. پی. یو. ایل. کو دیکھا جا سکتا ہے جو نشست کے شرکا سے مخاطب ہیں۔

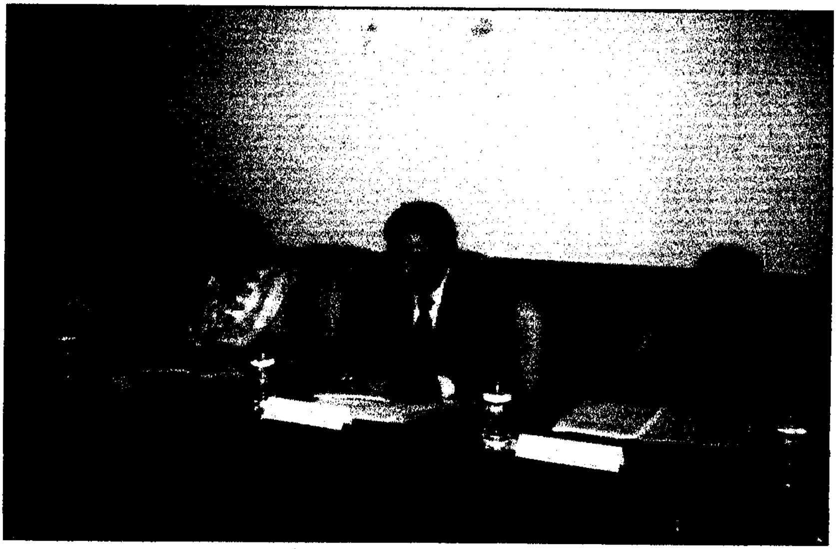

نشست کے شرکا میں دائیں سے پروفیسر اے. ایم. پٹھان، پروفیسر قمر رئیس، محترمہ نسیم بھاٹیہ اور جناب اقبال مجید

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔9، شمارہ۔4 اپریل 2007

مدیر: رشمی چودھری

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

معاون مدیر: ڈاکٹر رئیس احمد

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: اسد نیاز

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
26108159 فیکس: 26179657
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: ncpuleditorial@yahoo.co.in
urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات ..... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات ..... ادارہ 5

زبان اور تعلیم
● اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف ..... شمس الرحمن فاروقی 6
● اعلیٰ تعلیم اور کثیر ثقافتی معاشرہ ..... کے۔ این۔ پانکر 8
● انگریزی زبان پر عربی کا اثر ..... محمد سراج الدین 10
● عالمی بازار اور ہندوستان میں تعلیم ..... جان میکنسن 12

ادب
● کتنے پاکستان—ایک مطالعہ ..... چندر بھان خیال 14
● بنگال نشاۃ ثانیہ اور اردو ..... ابوبکر عباد 18
● ترانۂ اردو ..... محمد عرفان 21

تاریخ
● 1857 کی جنگ آزادی اور لکھنؤ ..... ارون کمار ترپاٹھی 23

سائنس
● شمسی توانائی ..... اقبال محی الدین 26
● ایکسرے اور ریڈیم کی دریافت ..... کاشف غزالی 29

ماحولیات
● ماحولیاتی آلودگی اور روشنی ..... فخرالدین وحید 32
● جنگلات کا تحفظ ..... فرزانہ اسد 34

شخصیت
● مجروح سلطان پوری ..... صادقہ نواب سحر 36

کیریئر
● ٹیلی ویژن نیوز ..... سمیع الرحمن 39
● سماجی اور فلاحی کارکن ..... الیاس انور 42

ہماری مطبوعات سے
● دیہی ٹکنالوجی ..... سید جعفر محمود 45
● احساس اور جذبہ ..... سید محمد محسن 49

اردو خبرنامہ ..... ادارہ 54
تبصرہ و تعارف ..... کتابوں پر تبصرے 72

بچوں کا گوشہ
● بہادر مینڈک ..... خسرو متین 77
● محبت کی زبان ..... سیما برمن 79

آپ کی بات

■ **محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد۔**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ مارچ 2007 موصول ہوا۔ ادبی رسائل کی تاریخ میں یہ رسالہ اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ ''اردو دنیا'' نے اپنے کردار اور مزاج کو زمانے کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ عہد حاضر میں اردو قارئین کو ایسے ہی معلوماتی اور پر مغز رسالے کی ضرورت ہے۔ اس رسالے نے اپنے پڑھنے والوں کو ادبی بصیرت کے ساتھ ساتھ لسانی اور تعلیمی شعور بھی عطا کیا ہے۔ ''بنیادی تعلیم میں سماجی اشتراک'' اردو ترجمہ — الطاف انجم بہت عمدہ اور معلوماتی ہے۔ مستقل کالم ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' — جناب شمس الرحمن فاروقی دلکش اور معلومات افزا ہے۔ اس کے مطالعے سے زبان اور لسانیات کے موضوع پر شکوک و شبہات فرو ہو رہے ہیں۔ صنعت و حرفت، دفتری انتظامیہ، شخصیات، سفرنامہ، کیریئر، ہماری مطبوعات سے اور بچوں کا گوشہ ایسے موضوعات ہیں جو خاص و عام قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔

■ **رضوان خان، سکریٹری، بزم اردو، 96 شیخ سرائے، سیتاپور۔ 261001**

''اردو دنیا'' مارچ 2007 کا شمارہ موصول ہوا، شکریہ۔ زبیر رضوی کا مضمون ''دیوان غالب — ایک تخلیق نواز ماخذ'' پسند آیا۔ جناب شائق احمد یحییٰ کا سفرنامہ بعنوان ''جرمنی کا سفر'' بھی دلچسپ ہے۔ خبرنامہ میں یہ خبر پڑھ کر خوشی ہوئی کہ اردو کے بین الاقوامی شہرت یافتہ نقاد محترم شمس الرحمن فاروقی کو ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد نے ڈی.لٹ کی ڈگری سے سرفراز کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بزم اردو سیتاپور کی جانب سے فاروقی صاحب کو دلی مبارکباد کے ساتھ ہی پروفیسر مغنی تبسم کو فروغ اردو ادب ایوارڈ برائے 2007 کے لیے منتخب کیے جانے پر بھی دلی مبارکباد پیش ہے۔ اس شمارے میں شامل جناب عبدالستار دلوی کا مضمون ''جدید تعلیم'' بہت عمدہ ہے۔ موصوف نے بجا فرمایا ہے کہ سائنسی علوم کا پرزور خیر مقدم کرنے کے باوجود ادب، شاعری اور سماجی علوم کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پلاسٹک کے موضوع پر محمد خلیل کا مضمون معلوماتی اور اہم ہے۔

■ **محمد شاہد پٹھان، 22 ٹی آر، راجستھان یونیورسٹی، جے پور۔ 302004**

تازہ شمارے (مارچ 2007) کے بیشتر مضامین معلومات افزا ہیں۔ ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' کا سلسلہ ادبی اور لسانیاتی نقطۂ نگاہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مطالعے سے نوواردانِ بساطِ علم و ادب کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ عبدالستار دلوی نے اپنے مضمون ''جدید تعلیم — عصری ضرورتیں اور اردو'' میں ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ادبی، اخلاقی اور تہذیبی تعلیمات و اقدار پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ بلاشبہ ''فلسفۂ تعلیم و تربیت'' نے اقوامِ عالم کی تاریخ میں انقلاب انگیز کارنامے انجام دیے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ خواجہ اکرام نے اپنے مضمون ''سائبر اسپیس اور اردو زبان کی تدریس'' میں نئے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر ''اردو کی تدریس'' کے سلسلے میں کمپیوٹر سائنس کے امکانات اور برکات سے فیضیابی کے لیے قابلِ غور تجاویز پیش کی ہیں۔ عمدہ ویب سائٹس کی تشکیل سے ''اردو تدریس'' کے مسائل کافی حد تک حل ہو سکتے ہیں۔ اردو کے فروغ کا یہ ایک کارگر طریقہ ہے۔ ''بنیادی تعلیم میں سماجی اشتراک'' اردو ترجمہ — الطاف انجم ''قاری کی بازیافت'' اردو ترجمہ — احمد کفیل کے علاوہ ''اردو اور ہندی کا لسانی ارتباط'' — انیس چشتی جیسے مضامین بھی معلوماتی ہیں۔ زبیر رضوی نے غالب کو اپنے خاص انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی ہے، ''منیر نیازی — غزل کے آئینے میں'' از سرور الہدیٰ ایک عمدہ کاوش ہے۔ ''شخصیات'' کے تحت سروجنی نائیڈو اور اسد بھوپالی پر مختصر مضامین کا سلسلہ قابل داد اور معلومات افزا ہے۔ ''آزادی کے بعد اردو نظم'' (ایک انتخاب) ''میرا سفر'' (شعری مجموعہ — ڈاکٹر ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام صدر جمہوریۂ ہند)، ''ادبی مقالات'' (مولانا حامد حسن قادری) اور ''طرز غالب'' (مصنف محمد عرفان) وغیرہ کتب کی اشاعتیں لائق استقبال ہیں اور ان کتابوں کے مبصرین میں محترم مخمور سعیدی، ڈاکٹر رئیس احمد، درخشاں زریں اور جاوید رحمانی نے زیر بحث کتب پر دیانت دارانہ تبصرے تحریر کیے ہیں۔ شمارے کے بقیہ مشتملات بھی مطالعے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قدر بوقلموں مباحث پر مشتمل رسالے کی اشاعت کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی واقعی مبارک باد کی مستحق ہے۔

■ **انوار انصاری، سابق سینئر آڈٹ آفیسر، اولڈ ہزاری باغ روڈ، اپوزٹ چنا بھٹہ، شانتی نگر، رانچی۔834001 (جھارکھنڈ)**

''اردو دنیا'' مارچ 2007 کا شمارہ پہلے ہفتہ ہی میں دستیاب ہو گیا شکریہ۔ ''ہماری بات'' کے تحت آپ نے بہت ہی اہم مسئلے کی جانب توجہ دلائی ہے۔ ان دنوں ہمارا سماج متعدد خرابیوں کی آماجگاہ بن گیا ہے اور برابر تنزلی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ نوجوانوں کی ذہنی تربیت اچھے ڈھنگ سے نہیں ہو رہی ہے۔ ہر شہری کو کوشش کرنی چاہیے کہ حب الوطنی، قوم پرستی، انسانی اخوت، ہمدردی اور اخلاقی قدروں کو آئندہ نسلوں میں منتقل کرے اور بچوں کو اچھی تربیت دے۔ شخصیات کے تحت سروجنی نائیڈو اور اسد بھوپالی مرحوم پر آپ نے عمدہ مضامین شائع کیے ہیں۔ سروجنی نائیڈو نے عورتوں کی آزادی، مساوات اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے نئی نسل میں شعور اور بیداری پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ تعلیم نسواں پر بہت زور دیتی تھیں۔ ان کے مطابق تعلیم حاصل کر کے ہی ایک عورت اپنے گھر اور سماج کے لیے بہترین کام کر سکتی ہے۔ پلاسٹک کے موضوع پر محمد خلیل کا مضمون جامع ہے۔ خبرنامہ کے مطالعے سے یہ جانکاری ہوئی کہ بہار میں اردو اکادمی ملازمین کو سرکاری ملازمین کا درجہ دیا گیا ہے، یہ ایک خوش آئند خبر ہے۔ آپ کے رسالے میں تبصرے کا معیار بہت بہتر ہے۔ مخمور سعیدی نے ''آزادی کے بعد اردو نظم'' (ایک انتخاب) اور ''میرا سفر'' شعری مجموعہ از ڈاکٹر ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام پر ڈاکٹر رئیس احمد کے تبصرے قابل ذکر ہیں۔

فروری کے شمارے میں آپ نے اداریے میں بہت کام کی بات پر اظہار خیال کیا ہے۔ ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' بے حد عمدہ اور معلومات آفریں ہے۔ ''داستان گوئی کا فن'' از شمسہ عارف، ''تفہیم داغ کی ایک تازہ کوشش'' از محمد شاہد پٹھان طالب علموں کے لیے بہترین مضامین ہیں۔ افتخار الزماں کا مضمون ''مجاہد آزادی چندر شیکھر آزاد'' اگرچہ مختصر ہے مگر قاری پر اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ نظم ''دو ہزار چھ'' از مظہر امام دل پر اپنا نقش قائم کرنے میں کامیاب ہے۔ روداد ''آٹھواں کل ہند اردو کتاب میلہ'' از احمد کفیل معلومات افزا ہے۔ مدحت لقمان کا مضمون ''کوکنگ گیس'' چند احتیاطی تدابیر'' عورتوں کے لیے معلوماتی ہے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ غرض کہ آپ کا یہ شمارہ علم و حکمت کے خزانے سے معمور ہے۔

■ **مشتاق احمد، رحم گنج، پوسٹ لال باغ، دربھنگہ۔846004 (بہار)**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ مارچ 2007 موصول ہوا، شکریہ۔ یہ شمارہ بھی تازہ دم ہے۔ مستقل کالم ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' — جناب شمس الرحمن فاروقی بہت معلوماتی ہے۔ بالخصوص ادب کے طلبہ اس کالم کے مطالعے سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ ''اردو زبان کی تدریس اور سائبر اسپیس'' از خواجہ اکرام محنت سے لکھا گیا ہے۔ کالم ''آپ کی بات'' میں حبیب الرحمن چغتائی کا خط پڑھا۔ موصوف نے میرے مضمون ''اردو میں وضاحتی کتابیات'' مطبوعہ فروری 2007 پر اپنی عالمانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ میں نے لفظ ''کتابیات'' اور ''کیٹلاگ'' کو مترادف کے طور پر نہیں لکھا ہے۔ جہاں تک سوال ہے محمد ضیاء الدین انصاری کے ذکر کا تو ان کا نام ضرور آنا چاہیے تھا۔

■ **جے۔ ایم۔ مہتہ، جے 186، ساکیت، نئی دہلی۔110017**

ماہنامہ 'اردو دنیا' نہایت دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور میرے بڑھاپے کے لمحات مصروفیت اور مسرت میں بدل جاتے ہیں۔ سبھی مضامین قابل تعریف ہوتے ہیں۔ مارچ کے شمارے میں انیس چشتی کا مضمون ''اردو اور ہندی کا لسانی ارتباط'' بصیرت افروز ہے۔ بہتر ہو کہ دونوں زبانوں کے دانشوران انیس چشتی کی تجاویز پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔ اس اہم مسئلے پر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کو بھی توجہ دینی چاہیے۔

■ **اختر سندیلوی، 34، فقیر گنج، کٹرا، الہ آباد۔211002**

''اردو دنیا'' ہمیشہ پابندی سے موصول ہوتا ہے۔ جہاں تک میرے علم میں ہے کوئی بھی رسالہ سرکاری یا غیر سرکاری اتنی پابندی سے شائع نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ادارہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ تمام مضامین کارآمد اور قابل تحسین ہیں۔ خصوصاً رسالے کا مستقل کالم ''اچھی اردو، روزمرہ، محاورہ، صرف'' قابل صد تحسین ہے۔ نظم ''دو ہزار چھ'' بھی خوب ہے۔ جناب احسان الرحمن نے بنیادی تعلیم میں اچھی روشنی دکھائی ہے، کاش لوگ ان پر عمل کریں۔ مشتاق احمد صاحب نے اردو میں وضاحتی کتابیات کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ محمد شاہد پٹھان نے ''تفہیم داغ کی ایک تازہ کوشش'' میں داغ مرحوم کے تلامذہ کے سلسلے میں تحقیق و تفہیم کی اہمیت و ضرورت پر زور دیا ہے۔ میں ان سے سو فیصدی متفق ہوں۔ محترمہ شمسہ عارف صاحبہ کا مضمون ''داستان گوئی کا فن'' بھی خوب ہے۔ میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ قصوں میں تیس تیس چالیس چالیس لوگ نہایت خاموشی سے سنتے تھے اور ایک آدمی رحل جس پر قرآن رکھ کر پڑھا جاتا ہے اسی پر رکھ کر سناتا تھا اور یہ عام مشغلہ تھا اور پابندی وقت سے شروع اور ختم ہوتا تھا۔ ''اردو دنیا'' کی خوبصورت ترتیب و تدوین پر میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

■ **حامد انور، اولڈ ایچ. بی. روڈ، شانتی نگر، رانچی (جھارکھنڈ)**

''اردو دنیا'' کا فروری 2007 کا شمارہ موصول ہوا۔ اچھی اردو: روز مرہ، محاورہ، صرف کے مطالعے سے میری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ شمسہ عارف کا مضمون ''فن داستان گوئی'' معلومات افزا ہے۔ مظہر امام ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی نظم ''دو ہزار چھ'' دل کو چھوتی ہے۔ میں نے اس نظم کو کئی بار پڑھا۔ ''خدا کی بستی کا آفتاب غروب ہوگیا'' عمدہ مضمون ہے۔ روداد ''آٹھواں کل ہند اردو کتاب میلہ کولکاتا'' از احمد کفیل پڑھ کر کتاب میلہ کی کامیابی کا علم ہوا۔ خبر نامہ بے حد معلوماتی ہے۔ خبرنامہ کے ذریعے مجھے پتہ چلا کہ ممتاز اردو مزاح نگار اور کالم نویس مجتبیٰ حسین کو میر تقی میر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا ہے، یہ ایک اچھی خبر ہے۔ شمارہ ہر لحاظ سے مکمل اور دلچسپ ہے۔

■ **شمیم احمد صدیقی، بی۔2، نسیم منزل، مادیہ گنج پولس پوسٹ، سیتاپور روڈ، لکھنؤ۔226020**

آپ کی توجہ فروری کے شمارے کے صفحہ 65 پر مبصر ایس. اے. رحمٰن کے ذریعے دیے گئے داغ کے اس شعر کی جانب مبذول کراتا ہے جس کے دوسرے مصرعے کو موصوف نے ''ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے'' تحریر فرما کر آپ کے موقر ماہ نامے کے معیار اور وقار کو مجروح کر کے رکھ دیا ہے۔ بندے کا گمان ہے کہ تبصرے کے لیے بیشتر کتابیں جواہر لال نہرو یونیورسٹی یا دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرس کو اس لیے دی جاتی ہیں کہ وہ مشاہرہ ملنے کے شوق میں جلد کام کر کے دے دیں گے نیز دہلی سے باہر کتابیں ارسال کرنے اور تبصرے کے ڈاک سے وصول ہونے میں جو وقت صرف ہوتا ہے وہ بچ جائے گا اور ساتھ ہی ان ریسرچ اسکالرس کی تربیت بھی ہو جائے گی لیکن کسی غیر ذمہ دار شخص کی وجہ سے جریدے پر حرف آنا بھی درست نہیں ہے۔

داغ کے مصرعے کی صحیح صورت وہی ہے، جو ایس. اے. رحمٰن نے لکھی ہے، بعض لوگ "ہندوستان" کی جگہ "سارے جہاں" لکھ دیتے ہیں جو اصل سے انحراف ہے اور درست نہیں۔ ایس. اے. رحمٰن پرانے لکھنے والے ہیں، نوآموز نہیں لیکن ادارہ اگر نئے لوگوں سے بھی تبصرے لکھواتا ہے اور وہ تبصرے اچھے ہوتے ہیں تو ان کی اشاعت میں کیا قباحت ہے۔ تبصرے مشاہرے پر نہیں لکھوائے جاتے، فی تبصرہ معاوضہ دیا جاتا ہے۔

ادارہ

■ **محفوظ عالم، بھتانی، اتری، ضلع گیا (بہار)**

فروری 2007 کا ''اردو دنیا'' نظر نواز ہوا۔ پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس شمارے کے مشمولات قابلِ تعریف ہیں۔ جناب وجے دیو سنگھ کا مضمون ''اردو فاصلاتی نظام تعلیم'' بے حد پسند آیا۔ اس نوعیت کے مضامین ہم جیسے طلبہ کے لیے سودمند ہیں۔ علاوہ ازیں اردو کے فاصلاتی نظام تعلیم اور کتابوں کی اشاعت کے تعلق سے قومی اردو کونسل کا لائحۂ عمل لائق تحسین ہے۔ ماہنامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' کی معیاری اور خوب صورت اشاعتوں کے لیے بطور خاص مبارک باد قبول فرمائیں۔

■ **تمنا مظفر پوری، جمیل کمپاؤنڈ، سمن پورہ، بی.وی. کالج، پٹنہ۔14**

''اردو دنیا'' بروقت مل رہا ہے اور میں دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ آپ لوگوں کی کوشش قابل تعریف ہے۔ جنوری 2007 کے شمارے میں مضمون ''رومن اردو کیوں'' مطالعے میں شامل رہا۔ اردو زبان اور فارسی رسم الخط کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ اردو الفاظ رومن رسم الخط میں لکھنے سے نہ صرف یہ کہ پڑھنا دشوار ہوگا بلکہ سمجھنا بھی دشوار ہوگا کیونکہ مختلف صورت اور صوت حروف سے معنی میں جو فرق آتے ہیں اور تلفظ سے ذہن فوراً اصل معنی تک پہنچ جاتا ہے۔ مثلاً صدا۔ سدا، زن۔ ظن، وغیرہ۔ مختلف صورت اور صوت حروف ہی تو اردو زبان کی خوبی ہیں۔ فروری کے شمارے میں مناظر عاشق ہرگانوی کی ''نظیر صدیقی (مرحوم) سے گفتگو'' خالص علمی، ادبی اور معلوماتی ہے۔

■ **ٹی. این. سریواستو، ایس۔3-K-24/6A، پرتاپ نگر کالونی، ٹک ٹک پور، وارانسی (یو. پی.)**

جنوری اور فروری کے دونوں شمارے موصول ہوئے۔ دیدہ زیب سرورق، معیاری مشمولات، اردو نواز اداریہ اور ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' سے لے کر ''رات کا قیدی'' تک ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ اور بصیرت افروز مضامین سے پُر اس طلسم ہوش ربا کا نظارہ واقعی جاڑے کی دھوپ کی طرح جسم اور دماغ کے لیے صحت بخش ہے۔ روزمرہ کی اردو اور ادبی اردو کی صحت کے لیے فاروقی صاحب کے نسخے نہایت مفید ثابت ہو رہے ہیں۔

■ **بابر شریف، غزل آرٹ گیلری، بقدوائی روڈ، مومن پورہ، ناگپور۔440018**

''اردو دنیا'' کا مطالعہ پابندی سے کرتا ہوں۔ ہر شمارہ اپنے مشمولات میں مختلف النوع مواد فراہم کراتا ہے۔ خاص طور پر تکنیکی مضامین بڑے اہتمام سے شائع ہوتے ہیں جیسے کمپیوٹر سائنس، لائبریری سائنس وغیرہ۔ ''اردو دنیا'' واحد جریدہ ہے جو اس طرح کے معلوماتی مضامین شائع کرتا ہے جس سے طلبہ و طالبات مستفیض ہو رہے ہیں۔

□□□

ہماری بات

ایک جمہوری نظام میں صحافت کی اہمیت مسلم ہے۔ سیاسی جماعتیں عوام تک اپنی بات پہنچانے کے لیے صحافت کا سہارا لیتی ہیں؛ حزب اقتدار ہو یا حزب مخالف کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ جمہوری نظام میں زمامِ حکومت عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور ان منتخب نمائندوں کو عوام کے سامنے جوابدہ بنائے رکھنے کے لیے جو جمہوریت کا اولین تقاضا ہے، اخبارات موثر کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر عوام میں کسی سبب سے بے چینی اور بے اطمینانی پائی جائے تو اس سبب کی نشاندہی اور عوامی جذبات و احساسات کو حکومت کے ایوانوں تک پہنچانے کا کام بھی صحافت کرتی ہے۔ اسی لیے صحافت کو جمہوریت کا اہم ستون قرار دیا گیا ہے اور صرف سیاست ہی نہیں زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ تعلیمی ہو، سائنسی ہو، معاشی ہو، تجارتی ہو، صحت عامہ سے تعلق رکھتا ہو یا مذہبیات و اخلاقیات سے متعلق ہو، صحافت کی کارگزاری سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ صحافت کی اہمیت ماضی میں بھی تھی، زمانہ حال میں بھی ہے اور آنے والے دنوں میں بھی یہ کم نہیں ہوگی۔

پرنٹنگ مشین کی ایجاد انسانی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا اور اس کے ساتھ ہی پرنٹ میڈیا کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ پرنٹ میڈیا نے انسانوں کے ذہنی ارتقا میں جو حصہ لیا اور ان کے تجربات و مشاہدات کو محفوظ کرنے اور انھیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے جو وسائل پیدا کیے ان کی بدولت ایک ایسی دنیا وجود میں آئی جو زیادہ کشادہ اور زیادہ روشن تھی۔ علم کی روشنی عام ہوئی تو ہر طرح کی ترقیوں کے راستے کھل گئے۔

ریڈیو کی آمد ہوئی تو بعض حلقوں میں اس شک کا اظہار کیا گیا کہ اب اخباروں کی اہمیت شاید کم ہو جائے گی لیکن یہ شک درست نہیں نکلا۔ ریڈیو جو خبریں یا دوسرا مواد نشر کرتا تھا، وہ فوراً ہی ہوا میں تحلیل ہو جاتا تھا جب کہ مطبوعہ الفاظ کی زندگی دیرپا ہوتی ہے۔ مطبوعہ الفاظ دیر تک ہمارے ذہنوں میں اپنی گونج پیدا کرتے رہتے ہیں اور بہت دور تک ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ ریڈیو کے بعد ٹیلی ویژن کا غلغلہ ہوا جو ریڈیو کے غلغلے سے بھی کچھ زیادہ بلند تھا۔ ریڈیو صرف آواز سناتا تھا، ٹیلی ویژن تصویریں بھی دکھانے لگا۔ لیکن یہ تصویریں بھی ایسا نگارخانہ قائم نہ کر سکیں جو دیرپا ہو، اور ایسے رنگوں سے عبارت ہو جو لمحوں کی گرد سے جلد ہی دھندلے نہ پڑ جائیں۔

بڑے شہروں سے قطع نظر ہندوستان کے طول و عرض میں آج بھی ایسے بے شمار قصبے اور گاؤں ہیں جہاں چائے خانوں اور عوامی نشست گاہوں پر پانچ دس لوگ جمع ہو کر اخبار کی بلند خوانی کرتے ہیں اور خبروں پر رائے زنی کرتے جاتے ہیں۔

آج سے دو سو سال قبل جب انگریزوں نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا تھا، تب عوام میں بیداری پیدا کرنے اور ملک پر غیر ملکی تسلط کے خلاف جذبات کو ابھارنے، نیز حصول آزادی کا جذبہ جگانے میں صحافیوں نے جو کام کیا، اس سے ہم واقف ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں کے خلاف زبان کھولنے والوں کو پھانسی کی سزا دے دی جاتی تھی یا گولی سے اڑا دیا جاتا تھا۔ ایسے سنگین حالات میں ملک بھر کے وطن دوست قلم کاروں نے جن میں صحافی آگے آگے تھے اپنی اپنی زبانوں میں قومی غیرت، حب الوطنی اور آزادی پسندی کی ایسی جوت جگائی جو امر تھی۔ ہندی اور اردو کے صحافی ہراول دستے کی حیثیت رکھتے تھے۔

اس سال جب ہم ہندوستان کی 1857 کی پہلی جنگ آزادی کا ڈیڑھ سو سالہ جشن منا رہے ہیں، ہمیں اپنے ان صحافیوں کو بھی خلوصِ دل سے خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہیے جنھوں نے مادرِ وطن کی عزت اور آزادی کے لیے اپنی جانیں نچھاور کر دیں۔ شہید صحافیوں میں سب سے پہلا نام مولانا محمد حسین آزاد کے والد اور بہادر شاہ ظفر کے استاد، ذوق کے دوست مولوی محمد باقر کا ہے۔ جنھیں 1857 کی لڑائی میں حصہ لینے کی پاداش میں انگریزوں نے گولی سے اڑا دیا تھا۔ بعد کے مجاہدین آزادی میں مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی جیسے بہت سے قومی رہنما ہیں جن کی صحافت نے وطنی جذبات کو ابھارا اور غیر ملکی حکومت کے خلاف فضا تیار کی۔

حکومت ہند کو چاہیے کہ جس طرح وطن کی حفاظت کے لیے شہید ہونے والے فوجیوں کی یادگاریں قائم کی جاتی ہیں، اسی طرح ان فدایانِ وطن قلم کاروں کی یادگاریں بھی قائم کرے، جنھوں نے آزادیِ وطن کے لیے جان و مال کی قربانیاں دی ہیں۔

□□□

شمس الرحمن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

اس کالم میں اردو روزمرہ اور اردو زبان کے بارے میں قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ ایک وقت میں تین سے زیادہ سوالات نہ پوچھے جائیں اور سوالات کا تعلق الفاظ کے استعمال، روزمرہ میں ان کے صرف اور ان کے معنی کے بارے میں ہو۔
ادارہ

سوال: کیا کسی لڑکی کا نام علمہ یا علمی رکھا جا سکتا ہے؟

جواب: علمہ کوئی لفظ نہیں ہے۔ اگر علم کے آگے چھوٹی ''ہ'' تائے تانیث کی ہے تو بے معنی ہے کیونکہ علم کی تانیث کچھ نہیں۔ اور اگر علمہ کی چھوٹی ''ہ'' تائے وحدت ہے تو بھی نام کی حیثیت سے بے معنی ہے، کیونکہ اس صورت میں ''علمہ'' کے معنی ہوں گے ''ایک علم'' جو کسی کا نام نہیں ہو سکتا۔ اور اگر علمہ کی چھوٹی ''ہ'' بطور ضمیر ہے تو اس کا مطلب ہوگا ''اس کا علم''۔ نام کے طور پر یہ بھی بے معنی ہے۔

علما البتہ ایک لفظ ہے، مگر ادھورا۔ یہ دراصل قرآنی دعا رب زدنی علماً (سورہ طٰہٰ، آیت 114) کا آخری لفظ ہے۔ تجوید کے اعتبار سے اس کو علما بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں، ''ایک علم، (لہٰذا) صرف علم۔'' ظاہر ہے کہ یہ بھی کوئی نام نہیں۔ رب زدنی علماً کا مطلب ہے، ''اے میرے رب، میرا علم بڑھا دے۔'' لہٰذا ظاہر ہے کہ علما، یا علماً کوئی نام نہیں ہو سکتا۔ بعض خوش عقیدہ لوگ قرآن کا کوئی لفظ لے کر اپنے بچوں کا نام قرار دے دیتے ہیں۔ قرآن کے ناموں کے مبارک ہونے میں کیا شبہ ہے، لیکن معنی کا بھی لحاظ اشد ضروری ہے۔

رہا سوال علمی کا، تو یہ بے شک بامعنی لفظ ہے۔ اردو میں یہ صرف صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جیسے، علمی کتاب، علمی مضامین، علمی نکتہ، اخبار علمی وغیرہ۔ لہٰذا تنہا لفظ علمی بھی کسی کا نام نہیں قرار پا سکتا۔ ہاں کوئی علمی خاتون، علمی خان، وغیرہ نام رکھ لے تو رکھ لے، لیکن ایسے نام سننے میں نہیں آئے۔ تخلص کے طور پر ضرور ممکن ہے۔ ''سیاست جدید'' کانپور کے ایڈیٹر مولانا اسحٰق کا تخلص علمی تھا۔

سوال: عربی میں ''شہر'' کے معنی ''مہینہ'' کے ہوتے ہیں، لیکن اردو میں یہ ٹاؤن، نگر، اور ضلع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کیوں؟

جواب: عربی کا ''شہر'' اور اردو فارسی کا ''شہر'' الگ الگ لفظ ہیں۔ عربی لفظ کا مادہ ش۔ ہ۔ ر۔ ہے جس کے معنی ہیں، ''نمودار ہونا، نمایاں ہونا۔'' چونکہ مہینے کا آغاز چاند کے نمودار ہونے پر منحصر تھا، لہٰذا شہر کے معنی ''مہینہ'' ہو گئے، یعنی جب چاند نمودار ہوا تو مہینہ شروع ہوا۔ فارسی کا لفظ ''ماہ'' بمعنی ''مہینہ'' بھی اسی منطق کی یادگار ہے۔

اردو فارسی لفظ ''شہر'' بمعنی City وغیرہ، بہت قدیم فارسی لفظ ہے۔ قدیم فارسی میں یہ لفظ کچھ ''کشستر'' کی طرح کا تھا۔ سنسکرت میں بھی یہ ''کشتر'' ہے جہاں سے ہم نے شہر بنا لیا۔

سوال: ''کانجی ہاؤس'' کا تلفظ کیا ہے، ''چالان'' کے اصل معنی کیا ہیں، اور ''ٹھوپاٹھے'' کس زبان کا یا بولی کا لفظ ہے؟

جواب: یہ آپ نے ایک کی جگہ تین سوال پوچھ دیے اور ان میں کسی کا کوئی خاص تعلق اردو زبان کے صرف یا روزمرہ سے نہیں۔ بہرحال، ان کا جواب ملاحظہ ہو:

''کانجی'' بروزن فاعلن یا بروزن کام جی، تامل اور تیلگو زبانوں کا لفظ ہے لیکن ہمارے یہاں غالباً انگریزی سے آیا ہے۔ تامل/تیلگو میں کانجی بہت پتلے پکائے ہوئے چاول کو کہتے ہیں، بلکہ اسے پکائے چاولوں کی پیچ یا پساون کہہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں غذائیت برائے نام ہوتی ہے۔ انگریزوں نے اسے Congee کہا لیکن تلفظ وہی کانجی رکھا۔ انگریزی انتظام میں جن سپاہیوں کو قید کی سزا دیتے تھے انھیں کھانے کے لیے صرف کانجی ملتی تھی۔ اس طرح، جس خیمے

میں یہ قیدی رکھے جاتے تھے اسے Congee House کہنے لگے۔ یہی نام پھر ان باڑوں یا چھپر کے گھروں کے لیے مستعمل ہو گیا جن میں آوارہ پھرنے والے جانوروں کو، یا کسی کے جانور کو بجبر اس کے مالک سے لے کر قید میں رکھا جاتا تھا۔ یہی لفظ اب بھی رائج ہے۔

''چالان'' اردو کا لفظ ہے۔ یہ ''چلنا رچلانا'' سے بنایا گیا ہے۔ اس کے معنی وہ کاغذ ہیں جس پر کسی سامان یا سامانوں کی فہرست درج کرکے وہ سامان کسی کے پاس بھیجا جائے (یعنی سامان کو چلایا جائے)۔ اس سے پھر یہ معنی بنائے گئے کہ وہ کاغذ جس میں کسی چیز، مثلاً کسی رقم کی کیفیت درج ہو۔ لہٰذا سرکاری خزانے میں جمع ہونے والی رقم جس کاغذ پر درج کی جاتی تھی اسے بھی چالان کہا جاتا ہے۔ اول الذکر معنی سے یہ معنی نکلے کہ وہ کاغذ جس پر ملزموں کی فہرست درج کرکے عدالت میں جمع کی جائے (یعنی وہ عدالت میں لے جائے جائیں) اسے بھی چالان کہا جائے۔ یہ لفظ ہندوستانی انگریزی میں مستعمل ہے، معیاری انگریزی میں نہیں ہے۔

پرتا پگڈھی (یعنی اودھی کی ایک قسم) اور مغربی بھوجپوری (یعنی بلیا، غازی پور، الہ آباد وغیرہ کی زبان) میں ''ٹھو رٹھے'' بمعنی ''عدد'' ہے۔ پوربی بھوجپوری، یعنی ضلع بھوجپور اور پٹنہ وغیرہ کی بولی میں یہی لفظ ''گو'' (مع واؤ مجہول) ہے۔ پوربی بھوجپوری میں اکثر ''ایک گو= ایک عدد'' ''گو'' ''ایگو'' بھی لکھتے اور بولتے ہیں۔

اس لفظ کی اصل نہیں معلوم۔ بنگالی میں عدد کو ''ٹا'' کہتے ہیں۔ ''ٹا'' اور ''ٹھو'' کی مشابہت واضح ہے۔ ممکن ہے یہی ''ٹا'' اودھی کے ''ٹھو رٹھے'' میں، اور پھر بھوجپوری کے ''گو'' میں بدل گیا ہو۔ سنسکرت یہ بہر حال نہیں ہے۔

(سوالات از محمد ابراہیم صدیقی، الہ آباد، یو. پی.)

سوال: اکثر شعرا اپنے شعروں میں ''پانی'' کی جمع ''پانیوں'' استعمال کرتے ہیں۔ کیا یہ جائز ہے؟

جواب: ''پانیوں'' بمعنی پانی کی کثیر مقدار، یا بہت طرح کا پانی، اردو میں مستعمل ہے، لیکن لغات میں درج نہیں۔ یہ شاید اس وجہ سے کہ ''پانیوں'' میں استعاراتی کیفیت ہے اور لغات میں استعاراتی معنی بہت کم درج کیے جاتے ہیں۔ انجیل کی کتاب ''پیدائش'' Genesis کے بالکل شروع کی آیتوں میں لفظ Waters بار بار آیا ہے، اس انجیل کے تمام پرانے تراجم میں Waters کا ترجمہ ''پانیوں'' ہی کیا گیا ہے۔ اگر عبارت کا مضمون اس کا تقاضا کرتا ہو تو مجھے لفظ پانیوں میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔

سوال: ''حرف'' کا صحیح تلفظ کیا ہے؟ بہت سے اہل علم حضرات اپنی تقاریر میں حُرف (اول مضموم) کہہ جاتے ہیں۔ صحیح تلفظ کیا ہے؟

جواب: ''حرف'' بمعنی حرف تہجی، مثلاً الف، یا بمعنی بات، جیسے ''وہ ایک حرف بھی نہ بولا''، اس لفظ کا ایک ہی تلفظ ہے، حَرف، بروزن بَرف، یعنی بڑی ح پر زبر ہے اور ر ساکن ہے۔ اس کی جمع (حروف) بروزن حضور میں البتہ بڑی ح پر پیش ہے۔ بعض لوگ عام بول چال میں ''حرف'' کی جگہ ''حروف'' ضرور بول جاتے ہیں لیکن اس کی کوئی سند نہیں۔

عربی میں حرف مع اول مضموم بھی ایک لفظ ہے، لیکن وہ بالکل مختلف لفظ ہے اور وہ اردو میں مستعمل بھی نہیں۔

(سوالات از شجاع الدین شاہد، ملاڈ، ممبئی، مہاراشٹر)

□□□

پتہ:
29-C, Hastings Road
Civil Lines
Allahabad (U.P.)

''اردو دنیا'' کے قارئین میں اس کالم کی خوب پذیرائی ہو رہی ہے۔ حال ہی میں بعض سوالات ایسے ارسال کیے گئے ہیں جن کا تعلق محض عربی اور فارسی زبان کے الفاظ اور ان کے معانی سے ہے۔ اگرچہ ان سبھی سوالات کے جوابات محترم شمس الرحمن فاروقی صاحب کی جانب سے دیے جارہے ہیں لیکن آئندہ سوالات کرتے وقت یہ خیال رہے کہ ارسال کردہ جملہ سوالات کا تعلق صرف اردو زبان اور اس کے روز مرہ سے ہو۔

سوالات ارسال کرنے والے حضرات اپنے نام کے ساتھ مکمل پتہ بھی ارسال کریں۔

فروری کے شمارے میں پہلے سوال کے جواب میں سطر تین، چھ اور دس میں 'مضموم' کی جگہ لفظ 'مضمون' چھپ گیا ہے۔ ادارہ اس غلطی کے لیے معذرت خواہ ہے۔

ادارہ

کے.این. پانکر

اعلیٰ تعلیم اور کثیر ثقافتی معاشرہ

یونیسکو عالمی کمیشن برائے تعلیم نے جیکس ڈلورس کی سرپرستی میں اکیسویں صدی کے لیے ''تعلیم برائے بقا'' اور ''تعلیم برائے ہم آہنگی'' کو چار ستونوں میں سے دو اہم ستون قرار دیا ہے۔ تعلیم برائے بقا فرد کی باطنی صلاحیتوں کی ترقی کے لیے زمین ہموار کرتی ہے جو فرد کو سماجی اور سیاسی ذمے داریوں کو نبھانے کے قابل بنا دیتی ہے جب کہ ''تعلیم برائے ہم آہنگی'' فرقہ وارانہ وفاداریوں اور اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اجتماعی زندگی کی تخلیق میں مصروف عمل ہوتی ہے۔ کوئی بھی تعلیم اقدار سے عاری نہیں ہوتی لیکن ہر سماج میں اقدار متنوع ہوتے ہیں۔ ایسا مختلف نظریاتی ضرورتوں کے پیش نظر ہوتا ہے۔ تاہم کچھ آفاقی اقدار ہیں جن کی ہر معاشرہ پاسبانی کرتا ہے۔ اقدار کی تشہیر کے لیے تعلیم ایک موثر اور کارگر ذریعہ ہے۔ تعلیم میں اقدار آفاقیت اور استثنائیت کا مجموعہ ہوتے ہیں، اور دونوں مختلف انسانی تجربات کے باعث تبدیل ہو سکتے ہیں۔ 1947 میں نوآبادیاتی عہد میں ہندوستانی دانشوران روایتی اور نوآبادیاتی نظام تعلیم سے مختلف نظام کے لیے کوشاں تھے۔ یہ روایت کو جدت پسندی سے ہم آہنگ کرنے کی ایک کوشش تھی جس کی ابتداً انیسویں صدی کے اوائل میں دانشورانہ سرگرمیوں سے تسلیم کی جا سکتی ہے۔ ہمارے ملک میں تعلیم میں جدید نظریات کے آغاز کا سہرا عموماً نوآبادیاتی نظام کے سر باندھا جاتا ہے جب کہ یہ اس کی مخالفت میں وجود میں آئے تھے۔ ہندوستانی دانشوروں نے ایک ایسے متبادل کو فروغ دینے کی کوشش کی جو نہ تو روایتی تھا اور نہ ہی استعماری۔ اگرچہ خیالات کی سطح پر اس نے دونوں سے استفادہ کیا۔ استعماری بالادستی کے علاوہ یہ متبادل ناقص تھا جو خاص کر نظریاتی سطح پر عملی اثرات سے عاری رہا۔ نتیجتاً جدید تعلیم یافتہ دانشوروں کی تعلیم وتربیت انھی سماجی اور سیاسی اقدار کے پس منظر میں ہوئی۔

سیکولر جمہوری اقدار کے خطوط پر قائم تعلیمی رجحان کو اس وقت بڑا دھکا لگا جب مرکز اور ملک کے بعض صوبہ جات میں حکومت کی باگ ڈور فرقہ پرست طاقتوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ہمارے ملک ہندوستان کو کثیر مذہبی سماج اور مختلف ثقافتی رویوں کا حامل ہونے کے باعث اقدار کی تعلیم کے مقاصد میں تعلیم کو مذہبی روایتوں میں انسان دوست عناصر کو مسترد کیے بغیر بنیادی طور پر سیکولر ہونا لازمی ہوگا، اور اس طریقۂ کار سے دو طرح کے اقدار رونما ہوں گے۔ ایک آفاقی اخلاقی اقدار جیسے سچائی، ایمانداری اور دردمندی اور دوسرا سیکولرازم جمہوریت اور مساوات یہ دونوں اقدار باہم استثنائی سمجھے جاتے ہیں۔

سیکولرازم کے تین ستون ہیں۔ یونیسکو رپورٹ میں مستعمل اصطلاح کے مطابق یہ تین ستون آفاقیت، انسان دوستی اور عقلیت ہیں۔ کثیر مذہبی سماج میں آفاقیت سیکولرازم کی نظریاتی بنیادوں میں سے ایک ہے۔ مشترکہ مذہبی سچائیوں کو اجاگر کر کے یہ مذاہب میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں معاون ہوگا ساتھ ہی مذاہب کے باہمی احترام میں بھی ممد ومعاون ثابت ہوگا۔ مختلف فرقوں کے مذہبی حقائق کے احترام کے بغیر کثیر مذہبی سماج بمشکل ہی پرسکون ماحول میں باقی رہ سکتا ہے۔ استعماری دور سے ہی مذہبی تنازعہ ہندوستانی سماج کے کریوں میں سے ایک ہے جو اور چیزوں کے علاوہ آپسی احترام کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ اس بنیادی عقیدے کی رو سے تمام مذاہب یکساں ہیں فرق صرف ان کے خارجی اظہار میں ہے۔

ہندوستان عموماً ایک کثیر ثقافتی معاشرہ ہے۔ اگر مساوات کثیر ثقافت پسندی کا مرکز ہے تو اس طرح اس کو موسوم کرنا مشکوک معقولیت کا باعث ہو سکتا ہے۔ درحقیقت ہندوستان ایک کثیر ثقافتی سماج ہے جو مختلف ثقافتوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ عملی طور پر تہذیبی مساوات ہنوز بہت دور ہے۔ اس سیاق وتناظر میں سیکولر اقدار کی تعلیم بہت اہم ہو جاتی ہے۔ ہندو فرقہ پرست طاقتوں کی تہذیبی بالادستی قائم کرنے کی کوشش اس عمل کو کافی متاثر کرے گی۔ ماضی کی اختراعی ثقافت کو خاص درجہ دینے کا رجحان کثیر ثقافت پسندی کے ممکنہ حصول کو خاص اہمیت نہیں دیتا۔ اس تناظر میں تعلیم میں سیکولرازم کو بطور اقدار شامل کرنا خاص اہمیت کا حامل ہے۔ حالیہ دنوں میں تہذیبی بالادستی قائم کرنے اور ماضی کی اختراعی مجرد ثقافت کو خاص درجہ دینے کا عمل اعلیٰ تعلیم کے شعبے پر حاوی ہوا ہے۔ تعلیمی اقدار کے ان تمام مباحث میں سیکولر اقدار اور اخلاقی اقدار کے مابین فرق کرنے کا رجحان ہے۔ یہ مفروضہ کہ سیکولر اقدار مختلف اور بے جوڑ ہیں اور

ان دونوں میں عاری تقسیم غیر حقیقی ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ عملی طور پر باہم مربوط ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ بیشتر اخلاقی اقدار ایک دوسرے میں مدغم اور پیوست ہیں مثلاً سیکولرازم کی بنیادوں میں سے ایک انسان دوستی ہے جو مذہبی تعلیمات سے ماخوذ جملہ اخلاقی اقدار کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ دردمندی، محبت اور باہمی یگانگت جیسی اخلاقی اقدار کو اپنانے کے لیے مذہب بھی ایک ممکنہ ماخذ نہیں ہے۔ سیکولر ماخذ سے اس طرح کے اقدار کی تعلیم ممکن ہے۔

تعلیم کے مختلف مقاصد ہو سکتے ہیں۔ تعلیم زندگی کے معانی و مطالب کو سمجھنے کے علاوہ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کے ادارک اور سماج میں ایک خاص اور بہتر مقام متعین کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ عہد حاضر میں ہندوستانی سماج عالمی اشتراک کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ مختلف قسم کے خلفشار رونما ہوں۔ ان میں سے ایک کا تعلق تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی ثقافتی اور علمی ماحول میں روایتی اقدار سے ہے۔ عموماً یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انھیں یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے احیا کی کوئی گنجائش بھی نہیں، اور اس کا حل دونوں اقدار کا تخلیقی انضمام و اشتراک ہے۔

(بشکریہ ''دی ہندو'' 8 فروری 2007)

□□□

تلخیص و ترجمہ --- ابوفہیم خاں
J3A/28A, Khirki Extn.
Malviya Nagar
New Delhi-110017.

ڈیوڈ کاپر فیلڈ (جلد اوّل)

مصنف: چارلس ڈکنس / مترجم: فضلِ حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشا پردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔ اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکسِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

(یوسف ناظم)

ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کو حاصل ہے۔

صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 066 110

محمد سراج الدین

انگریزی پر عربی زبان کا اثر

انگریزی زبان میں عربی زبان کے بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں اور ان الفاظ سے نکلے ہوئے الفاظ علاحدہ ہیں۔ ان میں کچھ لفظ ایسے ہیں جو انگریزی زبان بولنے والے روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً زیرو، الکحل، صوفہ وغیرہ۔ عربی زبان کے جو الفاظ انگریزی زبان میں مستعمل ہیں ان میں سے زیادہ تر براہ راست انگریزی زبان میں داخل نہیں ہوئے ہیں بلکہ دیگر زبانوں جیسے لاطینی، فرانسیسی اور ہسپانوی کے ذریعے داخل ہوئے ہیں۔ جو علمائے کرام بارھویں صدی عیسوی میں علم کیمیا، علم طب، علم نجوم اور علم الحساب کے متلاشی تھے انھوں نے عربی کتب کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا۔ قدیم اسپین میں عربوں کی بنائی ہوئی قرطبہ کی یونیورسٹی جس کی بنیاد نویں صدی میں پڑ چکی تھی، تمام یورپی ممالک کے طلبہ کی دلچسپی کا مرکز بنی۔ یہی صورت حال عرب اسپین کی دوسری یونیورسٹیوں میں پائی جاتی تھی۔

عرب فاتحین چھٹی صدی عیسوی سے لے کر پندرھویں صدی تک تقریباً آدھی دنیا پر حکومت کرنے لگے تھے اور ہر میدان میں چاہے وہ علمی ہو یا صنعتی، تجارتی ہو یا زراعتی، معاشی ہو یا سماجی ترقی کے ہر زینے پر پہنچ چکے تھے۔ یہی سبب ہے کہ دیگر اقوام کی تہذیب وتمدن اور زبان وفلسفہ پر عربی زبان اور عربی تہذیب یعنی مسلم تہذیب کے اثرات نظر آتے ہیں۔ عربی زبان کے بعض الفاظ علم نباتات، علم نجوم، علم کیمیا، علم طبیعیات، علم الحساب، علم طب وجراحی، علم جغرافیہ، سیاحت، موسیقی، علم پارچہ بافی اور رنگ سازی کی اصطلاحات کھلے ملے ہیں۔ انگریزی میں ان کی شکلیں اصل سے بہت مختلف ہوگئی ہیں۔ ان الفاظ کی اصل جاننے کے لیے ان کی مختلف اشکال اور تلفظ پر نظر کرنا ضروری ہے۔ عموماً عربی زبان کے وہ الفاظ جو سولھویں صدی سے پیشتر انگریزی میں داخل ہوئے ہیں وقت کے ساتھ ساتھ انگریزی تلفظ کی بنا پر خالص انگریزی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں جیسے جبرالٹر (Gibralter) یعنی جبل الطارق، اوسینا (Avicinna) یعنی ابوعلی سینا وغیرہ۔ موجود علم کیمیا میں کئی لفظ عربی سے ماخوذ ہیں جیسے لفظ الکمی (Alchemy) یعنی کیمیا گری۔ یونانی زبان میں کیمیا (Chyma) کے معنی ہیں پگھلی ہوئی دھات، عربی میں یہ Alchemy بنا اور انگریزی میں عربی زبان سے داخل ہوا۔ اس طرح لفظ الکویر (Elixir) ال اکسیر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس کا اصل یونانی لفظ زیران (Xerion) ہے جس کی کچھ خصوصیات تھیں۔ ان خصوصیات کی بنا پر یہ عربی میں ''ال اکسیر'' ہوگیا اور اس کے بعد لاطینی زبان سے ہوتا ہوا چاسر کے انگریزی کلام میں داخل ہوا۔

الکحل (Alcohal) عربی لفظ ہے لیکن یہ مرکب شے عربوں کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ اس کا پہلے پہل تذکرہ نویں یا دسویں صدی کی اطالوی زبان میں ملتا ہے۔ مسلمان الکحل کو ایک سفوف کی حیثیت سے جانتے تھے جو ابروؤں کو رنگنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

الکلی (Alkali) عربی لفظ القلی، پوٹاشیم کی کیمیائی علامت "K" کا ماخذ ہے۔ ''انٹی منی'' کا اصل عربی لفظ ''اثمد'' ہے جو ایک دھات ہے۔ علم کیمیا کو باقاعدہ سائنس کی شکل دینے والے مسلمان ہیں کیونکہ اس میدان میں جہاں یونانی صرف صنعتی تجربات اور دھندلے نظریات رکھتے تھے وہاں عرب کے باشندے باقاعدہ مشاہدات اور مکمل تجربات کیا کرتے تھے۔ انھوں نے المبک (Alembic) یعنی قرنبیق ایجاد کیا اور اس کا نام رکھا ''المبک۔'' یہ ایک ایسا برتن ہے جس کی مدد سے تجربہ گاہ میں بھپکا دیا جاتا ہے۔ آج بھی دنیا کی ایک مشہور دواساز کمپنی ''المبک'' کے نام سے موسوم ہے۔

علم الحساب کے میدان میں عربی زبان کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ زیرو (Zero) جس کی طاقت علم حساب میں سب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے، عربی کے زیر اثر وجود میں آیا۔ 976 میں محمد بن احمد اپنی کتاب ''سائنس کی کنجیاں'' میں لکھتے ہیں کہ اگر گنتی میں کوئی عدد عشری جگہ پر نہ ہو تو ایک چھوٹا سا دائرہ استعمال کرنا چاہیے تاکہ اعداد کی قطار قائم رہے۔ مسلمانوں نے اس دائرے کو ''صفر'' یعنی خالی کہا۔ لاطینی علما نے صفر کو زیفرم (Zepherum) میں تبدیل کر دیا اور بعد میں اطالویوں نے اس کی تخفیف کر کے اسے زیرو بنا دیا، یہی زیرو آج انگریزی میں مستعمل ہے۔ الگورزم (Algorism) یعنی عربی ''اعشاریہ'' عہد مامون کے مشہور ریاضی داں محمد بن موسیٰ الخوارزمی کی نسبت سے یہ لفظ بنا ہے۔ 813 میں الخوارزمی نے اپنے نجومی خاکوں میں ہندوستانی اعداد استعمال کیے۔ اس کے بعد الگورزم کے معنی ہوگئے ہر وہ حسابی طریقہ جو عشری علامت پر منحصر ہوتا ہے اور یہی نظریہ آج بھی مروج ہے۔

علم فلکیات اور علم نجوم میں بھی عربی زبان کے الفاظ انگریزی زبان میں در آئے ہیں مثلاً ازیمت (Azimuth) زنت (Zenith) السیانک

(Almanac) وغیرہ۔ ''ازیمت'' اس قوس آسمانی کو کہتے ہیں جو سمت الرّاس سے افق تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ عربی لفظ سمت سے بنا ہے۔ ''زنت'' کے معنی سمت الراس کے ہیں یعنی آسمان میں وہ نقطہ جو دیکھنے والے کے ٹھیک سر پر ہو۔ آج کل یہ لفظ عام زبان میں نقطۂ عروج کی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

آلات موسیقی اور ان کے نام جیسے لوٹ (Lute) تمبورین (Tamburine) ریبک (Rebeck) گٹار (Guitar) وغیرہ عربی زبان کے رہین منت ہیں۔ ''لوٹ'' عربی لفظ ال۔اد (Al=Ud) سے بنا ہے۔ عربی ریبک (Rebeck) یا ربائبل (Rebible) آلہ موسیقی ہسپانوی زبان میں ریبل (Rebel) اور پرتگالی میں ریبیکا (Rebeca) کہلانے لگا اور آج بھی یہ لفظ پرتگالی میں وائلن (Violin) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

فن تعمیر میں بھی عربی زبان کے بعض الفاظ مثلاً ''مینار'' جس کے معنی روشنی کے گھر کے ہیں۔ مینارٹ (Minaret) لفظ مدھانہ (Madhana) سے بنا ہے یعنی وہ جگہ جہاں سے موذن کھڑے ہوکر اذان دیتا ہے۔ اڈمرل (Admiral) اور جبرالٹر بھی (Gibralter) عربی الفاظ سے بنے ہیں۔ ''اڈمرل'' یعنی بحری بیڑے کا افسر اعلیٰ عربی زبان کے دو الفاظ امیر (سردار) اور البحر (سمندر) سے مل کر بنا ہے۔ اڈمرل اسی ''امیر البحر'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

کپڑوں کی کئی قسمیں ان عرب ممالک کے نام سے موسوم ہیں جہاں وہ تیار کیے جاتے تھے۔ چانسر (Chancer) کے زمانے میں فسٹین (Fustian) کے نام سے جو کپڑا مشہور تھا وہ فستات (Fustat) کا بنا ہوا تھا جو مصر کے مسلمان حکمرانوں کا اولین پایۂ تخت تھا۔ دمسک (Damask) نامی کپڑا پہلے پہل دمشق میں جو کہ دنیائے تجارت کا بڑا مرکز تھا بنایا گیا۔ مسلن (Muslin) (ململ) اسے اطالوی تاجر موصل سے درآمد کیا کرتے تھے۔ بغداد اطالوی زبان میں بل ڈاکو (Baldaco) کہلاتا ہے۔ اس طرح وہ ریشمی کپڑا جو بغداد میں بنایا جاتا تھا اور جو آج کل گرجا گھروں میں زینت کے لیے لٹکایا جاتا ہے بل ڈاچنو (Baldachino) کے نام سے مشہور ہوا۔ ایران کا تفتھا (Taftah) تفیٹا (Taffeta) کے نام سے مشہور ہے۔ بغداد کا اتابیا (Atabiya) یا ''اتاب'' محلہ جہاں ایک صحابی کے خاندان والے رہتے تھے بارھویں صدی عیسوی میں ایک خاص قسم کے کپڑے کے لیے مشہور تھا جو اسپین میں پہنچ کر ''اتابی سلک'' کے نام سے مشہور ہوا۔ فرانس اور اٹلی میں یہ تابس (Tabis) کے نام سے رائج ہوا اور آج بھی اسی نام سے پورے یوروپ میں معروف ہے۔ للاک (Lilac) ایک قسم کا رنگ ہے جو ایران میں بھی اسی نام سے مشہور تھا۔ یہی رنگ آج کل سلک کے کپڑوں کی رنگائی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ املی کو انگریزی میں تامرنڈ (Tamrind) کہتے ہیں۔ ہندوستان میں عربوں نے جب پہلے پہل املی کے درختوں کی کثرت دیکھی تو انھوں نے اس کو ''ثمر الہند'' یعنی ہندوستان کا پھل کہا۔ لفظ ثمر کا حرف ''ث'' انگریزی میں ''ت'' یا ''ٹ'' بن گیا اور ''الہند'' کا مخفف ''انڈ'' ہوگیا۔ اس طرح ثمر الہند بگڑتے بگڑتے انگریزی زبان میں ''تامرنڈ'' بن گیا۔ اورنج (Orange) بھی عربی سے ماخوذ ہے۔ اور ''نارنج'' سے بنا ہے۔ اصل لفظ ''نارنج'' تھا جو ''ناریج'' میں بدلا اور بعد میں ''اورنج'' میں تبدیل ہوگیا اور یہی انگریزی میں مستعمل ہے۔ سیرپ (Syrup) عربی لفظ ''شراب'' سے بنا ہے۔ اسی طرح لیمن (Lemon) سوگر (Sugar) بازار، کارواں، میاٹرس (Matress)، صوفہ، چیک (Cheque)، ٹیرف (Tariff)، میگزین (Magazine)، رسک (Risk)، المامیٹر (Almameter) اور کئی دوسرے الفاظ عربی زبان کے زیر اثر وجود میں آئے ہیں اور انگریزی، ہسپانوی، اطالوی اور دوسری یورپی زبانوں میں مستعمل ہیں۔ بہت سے مسلمان عرب علما کے نام بھی انگریزی زبان میں اس طرح گڈمڈ ہوگئے ہیں کہ وہ خالص انگریزی نام معلوم ہوتے ہیں جیسے ابن رشد (مشہور فلسفی) انگریزی میں اوروس (Averoes) کے نام سے مشہور ہیں۔ ابن سینا مشہور فلسفی و سائنس داں اوسنا (Avicinna) اور عظیم طبیب ابن زہر (Avenzoa) کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔

□□□

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔

گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔

اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولین ہے۔

جان میکنسن

عالمی بازار اور ہندوستان میں تعلیم

یہ میری خوش نصیبی تھی کہ 73-1972 میں لوڈیل کے لارنس اسکول میں بحیثیت استاد میری تقرری ہوئی اور 1947 کے موسم گرما میں ہندوستان کے شہر چینئی میں حامیان تعلیم کے ساتھ کام کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ گذشتہ 32 سال کے دوران تعلیم کے میدان میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں تعلیم کی طرح زندگی کے کچھ ہی شعبے ایسے ہیں جو ہر سطح پر حکومت کی توجہ کا مرکز ومحور رہے ہیں۔ تعلیم معاشی خوشحالی کا پروانہ ہونے کے ساتھ ساتھ آزاد، کھلے اور مہذب معاشرے کی ضمانت بھی ہے۔

جب 1960 اور 1995 کی درمیانی مدت میں چودہ ملکوں میں مختلف اوقات میں کام کرنے والے ماہرین کے ذیل میں اوٹاوایونیورسٹی کے ماہرین معاشیات نے تعلیم بالغان کے عالمی سروے کے دوران انھیں انسانی سرمایہ میں سرمایہ کاری اور اس کے باعث کسی بھی ملک کی ترقی اور کام کرنے والوں کی فراہمی سے متعلق ایک واضح مناسبت کا علم ہوا۔ انسانی سرمایہ ایک ایسی ناخوشگوار اصطلاح ہے جو خاص کر مہارت کے متمنی لوگوں کی تعلیمات وعقائد کی وضاحت کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ عالمی تناسب کی مناسبت سے ایک فیصد خواندگی میں اضافے کو 2.5 فیصد مزدوروں کے کام میں اضافہ اور فی کس 1.5 فیصد مجموعی ملکی پیداوار (GDP) میں اضافے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بلجیم، فائن لینڈ اور اٹلی نے فی مزدور کے کام میں سب سے تیزی سے اضافہ درج کیا ہے اور مہارت میں سب سے کم بہتری لانے والے تین ممالک نیوزی لینڈ، سویڈن اور امریکا میں پیداواری ترقی اوسط سے کم ہے۔

لوڈیل میں معلومات عامہ کی کلاس میں ہم نے جو مشاہدہ کیا ہے وہ تعلیم میں بے تحاشہ اضافہ ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا موضوع اسکول کی بنیادی اور ثانوی دونوں تعلیم کے لیے یکساں اہمیت کا حامل ہے۔

میرا پہلا موضوع Growth اور نمو ہے۔ جسے تعلیمی دانشوران اور حامیان تعلیم کبھی کبھار Massification کا نام بھی دیتے ہیں جو غیر مناسب ہے۔ 1960 میں پوری دنیا میں اعلیٰ تعلیم میں داخلہ تیرہ ملین تھا، جو صدی کے آخر میں بڑھ کر اسّی ملین ہوگیا۔ ترقی یافتہ ممالک میں ہائی اسکول پاس نصف طلبہ اعلیٰ تعلیم میں داخلہ لیتے ہیں اور اسے ایک حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے 60 سال قبل یورپ اور امریکا میں ثانوی تعلیم کو ایک حق تسلیم کیا گیا تھا۔ چین میں ایک دہائی کے دوران اعلیٰ تعلیم میں طلبہ کا تناسب دوگنا ہوگیا ہے جب کہ ہندوستان میں 1990 کی دہائی میں 4.9 ملین سے بڑھ کر 9.4 ملین ہوگئی ہے جو تقریباً دوگنی ہے۔ Growth اور بڑھوتری مستقل پریشانیوں کا پیش خیمہ بھی ہوتی ہے، جس کو قومی سطح پر بھی محسوس کیا گیا ہے۔ فی الحال یونیورسٹی آف روم میں تقریباً 180,000 طلبہ کا داخلہ ہے۔ میکسیکو کی نیشنل یونیورسٹی میں 200,000 طلبہ اور ترکی کی انڈالو یونیورسٹی میں 530,000 طلبہ ہیں۔ اس تعداد کے پیش نظر معیاری تعلیم کو کس طرح یقینی بنایا جاسکتا ہے اور ہر طالب علم کو انفرادی تعلیم کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟

اعلیٰ تعلیم اب کھلا اور عالمی سطح پر مسابقتی بازار ہوگیا ہے جس میں سب سے زیادہ باصلاحیت اور سب سے زیادہ فیس دینے کی صلاحیت رکھنے والے طلبہ اور نہایت ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ سب سے زیادہ وسائل وشہرت کے مالک اداروں اور بیرونی ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ اس میں کچھ مسائل اور چیلنج کے ساتھ ساتھ تکنیکی طور سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے لیے مغربی ممالک میں جانے کے مواقع بھی حاصل ہیں۔ یورپی کمیشن کے اعداد وشمار کے مطابق فی الحال امریکہ میں تقریباً 400,000 یورپی سائنسی محققین کام کررہے ہیں اور اس میں سے 300,000 نے دوبارہ واپس نہ آنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ 1997 اور 2003 کے درمیان برطانوی یونیورسٹیوں میں غیر یورپی طلبہ کی تعداد 60 فیصد بڑھ گئی ہے اور ایسا چینی طلبہ کے وافر تعداد میں آنے کے باعث ممکن ہوسکا جن کی مجموعی تعداد اب 30,000 سے تجاوز کرگئی ہے۔ بہتات اور عالم کاری کے دہرے چیلنج کا حل تعلیمی نظام کے مخصوص شعبوں میں نجی سرمایہ کاری کا آغاز ہے۔ ٹکنالوجی کے بہتر استعمال اور مقامی ضرورتوں کے مطابق تعلیم کو مفید اور کارآمد بنانے کے علاوہ ٹکنالوجی کے ذریعے تعلیم کو فرد کی ضرورت کے مطابق بنانے میں ہے۔ کوئی بھی تعلیمی تنظیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ عوامی اعتماد اور حصے داروں کے مفاد کو تسلیم کرنے اور ان

دونوں کے مابین توازن قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ امریکی یونیورسٹیوں کی اعلیٰ تعلیم کے جملہ شعبہ جات میں انھی کا غلبہ ہے اور یہ منفرد نجی،عوامی ماڈل کی دین ہے۔ معاشی تعاون اور ترقی کی تنظیم (OECD) کے مقابلہ میں امریکہ ہر طالب علم پر دوگنی رقم خرچ کرتا ہے، یعنی ہر طالب علم پر وہ سالانہ 22,000 امریکی ڈالر خرچ کرتا ہے۔ امریکہ اعلیٰ تعلیم میں مجموعی ملکی پیداوار (GDP) کا 2.7 فیصد خرچ کرتا ہے جب کہ متحدہ ممالک میں یہ محض ایک فیصد سے تھوڑا زیادہ ہے۔

امریکہ کے علاوہ دیگر کامیاب ماڈل اور نمونے بھی ہمارے پیش نظر ہیں جن پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔ ملیشیا میں 1990 کی دہائی میں نجی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا اور اب ان کی تعداد سرکاری یونیورسٹیوں سے زیادہ ہے۔ ہم نے ہندوستان میں نجی شعبے کی بڑھتی ہوئی خدمات کا جائزہ لیا ہے اور معیار کا مسئلہ موجود ہے۔ ہندوستان میں NIIT کے چالیس مراکز اور دو ہزار خود مختار شاخیں ہیں۔

چین میں ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں معیار کو بلند کرنے والے اہم پروجیکٹ میں ہماری حصے داری اور شراکت کو سراہا گیا ہے جس سے ہماری حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں مختلف صوبے۔ مثلاً راجستھان، تامل ناڈو، آندھرا پردیش اور کرناٹک عملی طور پر نجی اور عوامی حصے داری اور شراکت کے ماڈل پر غور وخوض کر رہے ہیں لیکن وہاں بھی سیاسی اور ثقافتی روکاوٹیں ہیں۔ نجی سرمایہ، بڑھوتری اور دوہرے چیلنج سے نپٹنے کا ایک طریقہ ہے۔ امریکی ادب میں ''ونیلا درسی کتب'' قدیم یادگار کا حصہ ہیں۔ جو چیزیں ہم دستیاب کرا رہے ہیں، ان میں روایتی متن شامل ہوتا ہے اور ویب کے ذریعے انھیں تقویت پہنچائی جاتی ہے۔ یہ پروگرام مکالماتی ہیں جن کے ذریعے طلبہ اور اساتذہ کی براہ راست بات چیت ہو سکتی ہے جس سے طلبہ کو بڑی آسانی ہوتی ہے۔ مواد انفرادی کالجوں اور اساتذہ کی ضرورتوں کے مطابق تیار کیا جاتا ہے اور ایسے آلات نصب کیے جاتے ہیں جو پیش رفت کے حوالے سے تجزیے کو ممکن بناتے ہیں۔ فلپائن میں Nokia کی شراکت میں موبائل فون کے ذریعے دور دراز کے اسکولوں میں تعلیمی ہدایات ارسال کی جاتی ہیں۔ امریکی طلبہ اور اساتذہ میں تکنیکی آلات کے تعارف میں اہم رکاوٹ تکنیکی سے زیادہ نفسیاتی ہے لیکن جب دنیا کو 2 بلین موبائل فون اور روزانہ ایک بلین گوگل کے استعمال پر فخر ہو اور جہاں سالانہ 9,000 بلین ای میل بھیجے جاتے ہوں وہاں ای لرننگ کوئی بڑی بات نہیں۔

تعلیمی مواد کی دیکھ ریکھ کے نظام میں سب سے معیاری اور بہترین تحقیق جنوبی ہند میں ہو رہی ہے۔ اس تکنالوجی کے استعمال کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ تعلیمی مواد کو ضرورت کے مطابق بہ آسانی ڈھالا جا سکتا ہے اور پوری کلاس کے بجائے فرد کو، کلاس کے بجائے فرد کی رفتار وصلاحیت کے مطابق پڑھانا ممکن ہے۔ ہم ایک عالمی پبلشنگ کمپنی کی حیثیت سے مہارت، مالی وسائل، تکنیکی آلات اور عالمی تنظیم کے تحقیقی اثاثے کو بہم پہنچانے اور مقامی سطح پر بامقصد اور بامعنی بنانے میں توازن قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں ہندوستان میں تعلیم کے مستقبل سے متعلق پُر امید ہوں۔ جن عناصر کی بدولت خارجی تعاون میں اضافہ ہوا ہے ان میں تکنالوجی میں دسترس، انگریزی زبان میں روانی اور مہم جوئی کے حوصلے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس ضمن میں اگر ہم تکنالوجی کی طاقت کو بروئے کار لائیں اور عوامی ونجی اداروں میں سرمایے کے مابین مضبوط شراکت قائم کر سکیں تو یہاں پر مزید بہتر مواقع ہیں۔

(بشکریہ ''دی ہندو'' 23 جنوری 2006)

□□□

تلخیص وترجمہ ــــ ابوفہیم خاں
J3A/28A, Khirki Extn.
Malviya Nagar
New Delhi-110017.

مراسلات اور مضامین صاف اور خوش خط ارسال فرمائیں۔
فوٹوکاپی قابل قبول نہیں ہوگی۔
(ادارہ)

چندر بھان خیال

کتنے پاکستان — ایک مطالعہ

انسانی معاشرے کا ایک بھیانک المیہ فرقہ واریت اور علاحدگی پسندی کا زہر ہے۔ یہ زہر آغاز ہی سے معاشرے کی رگوں میں گردش کر رہا ہے۔ انسانی معاشرہ جیسے جیسے وسعت اختیار کرتا گیا یہ زہر بھی پھیلتا چلا گیا۔ کبھی رنگ و نسل کی برتری کے نام پر، کبھی تہذیبی و لسانی شناخت کے نام پر، کبھی تاریخی و جغرافیائی امتیاز کے نام پر اور کبھی مذہبی و سیاسی اقتدار کے حصول کی ہوس میں، انسانی یک جہتی ٹکڑوں میں تقسیم ہوتی چلی آئی ہے۔ حکومت و سہولت کے لالچ میں انسانوں نے پہلے خود کو فرقوں میں بانٹا اور پھر فرقوں کو برادریوں اور کنبوں میں بانٹ کر آج پشیمان و پریشاں ہے۔ منتشر معاشرے کے اس کرب سے ہی جذبۂ اتحاد و اخوت نے جنم لیا ہے۔ یہ جذبہ مجسم ہو کر جب سرگرم ہوتا ہے اور ہاتھ میں قلم لے کر للکارتا ہے تو کملیشور جیسے لوگوں کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ انسان ازل سے ہی جینے کی تمنا میں بے قرار ہے۔ زندگی کی یہی تلاش و جستجو اسے مسلسل جدوجہد پر آمادہ کر رہی ہے اور جب تک یہ تلاش ختم نہیں ہوتی وہ نت نئے مرحلوں اور منزلوں سے گزرتا رہے گا۔ زندگی کے لیے یہی بے قراری، یہی تڑپ انسان کو تاریک غاروں سے نکال کر روشن آسمانوں میں لے آئی ہے۔ ایک اضطراب ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ بے قراری کا عالم یہ ہے کہ ہر آنے والا المیہ ایک ایٹمی دھماکے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس دھماکے کی دھول میں کھڑے انسان کی تلاش زندگی میں پہلے سے زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بے قراری بھی بے حد شدت اختیار کر چکی ہے۔ یہ انسانی اضطراب اور حرارت جو ایک تحریک کی صورت ہر لحہ ہمارے ساتھ ہے، کملیشور جیسی شخصیتوں کی مرہون منت تسلیم کر لی جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ایسی شخصیت وشال اور وسیع سمندر کی مانند ہوتی ہے جسے چند جملوں یا ایک چھوٹے سے مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ لہٰذا میں نے اپنی سہولت کے لیے کملیشور کے حالیہ ناول ''کتنے پاکستان'' (اردو ترجمہ۔ ڈاکٹر خورشید عالم) کا انتخاب کیا ہے۔

''کتنے پاکستان'' کے بارے میں پہلا سوال یہی اٹھتا ہے کہ آخر یہ پاکستان ہے کیا چیز؟ وہ پاکستان جس نے وجود میں آتے ہی 20 لاکھ سے زیادہ لوگوں کی جان لے لی، لاکھوں عورتوں کی آبرو ریزی کا سبب بنا، لاکھوں خاندانوں کو اجاڑ کر ادھر سے ادھر کر دیا اور جو نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی اس برصغیر کے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں کشیدگی، بے چینی، بے اعتمادی اور انتشار کا سبب بنا ہوا ہے، یہ آخر آیا کہاں سے اور کن بنیادوں پر قائم ہے؟ درحقیقت کملیشور کے ناول کا پاکستان وہ نہیں جس کی راجدھانی اسلام آباد ہے یا جس کا ایک شہر کراچی ہے، جہاں سابق نائب وزیراعظم ہند جناب لال کرشن آڈوانی کا جنم ہوا یا جس کی کرکٹ ٹیم بھارت کی کرکٹ ٹیم سے کبھی ہار جاتی ہے تو کبھی جیت جاتی ہے یا 1971 میں جس سے الگ ہو کر بنگلہ دیش وجود میں آیا، یا جس کی ریاست سندھ میں ہندوستان سے گئے لاکھوں مسلمان آج بھی مہاجر کی زندگی جی رہے ہیں۔

مصنف: کملیشور پرساد سکسینہ
قلمی نام: کملیشور
تاریخ پیدائش: 6 جنوری 1932
وطن: ضلع مین پوری (یو. پی.)
تعلیم: الٰہ آباد یونیورسٹی سے ہندی میں ایم.اے.
وفات: 27 جنوری 2007 کو سورج کنڈ، فرید آباد میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے

- پدم بھوشن ایوارڈ 1995
- ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2003
- شکھر ساہتیہ سمان ایوارڈ
- شاہکار ناول ''کتنے پاکستان'' کا بیس زبانوں میں ترجمہ
- سو سے زائد فلموں کے اسکرپٹ اور ڈائیلاگ کے علاوہ ٹیلی سیریل ''چندرکانتا''، ''یگ'' اور ''بے تال پچیسی'' کے ڈائیلاگ اور اسکرپٹ بھی لکھیں۔
- تین سو سے زائد کہانیاں بھی لکھیں۔
- دوردرشن کے اڈیشنل ڈائرکٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔
- ''دینک جاگرن''، ''دینک بھاسکر''، ''واما''، ''ساریکا''، ''کتھا یاترا''، ''گنگا''، ''انگت'' اور ''شری ورشا'' جیسے مقبول اخباروں اور رسالوں کے مدیر رہے۔

کملیشور کی نگاہ پوری تاریخ انسانی پر ہے۔ ان کی نگاہ میں پاکستان اس جذبے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی دھرتی کو ٹکڑوں میں بانٹتا ہے، اس فکر کا نام ہے جو انسانوں میں انتشار کا سبب بنتی ہے، اس نفرت کا نام ہے جو علاحدگی پسندی کو ہوا دیتی ہے، اس مفاد کا نام ہے جو مذاہب انسانی کے درمیان فسادات کو جنم دیتا ہے اور اس تحریک کا نام ہے جو اقتدار کی ہوس میں امن وسکون کا دشمن بن جاتی ہے۔ یہ پاکستان دنیا کے کسی بھی ملک میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس پاکستان کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ خود پاکستان میں بھی یہ پاکستان سر اٹھائے پھر رہا ہے— '' ہندوستان بنگالیوں کو ان کا پاکستان بنانے میں مدد کر رہا ہے۔ بھئی یہ خود پاکستان، اس میں کتنے پاکستان پیدا ہوں گے۔ پنجاب کے سرائیکی نیا صوبہ مانگ رہے ہیں، پرانے سندھی اپنا سندھو دیش بنانا چاہتے ہیں، پختون اپنا پختونستان چاہتے ہیں۔ عطاء اللہ مینگل آزاد بلوچستان مانگ رہا ہے اور اپنے مہاجر بھائی کراچی میں اپنا ایک اور پاکستان بنانا چاہتے ہیں۔ سنا ہے وہاں ہندوستان کے ہندو بھی ہندوستانیوں سے اپنا ہندوتو وادی پاکستان مانگ رہے ہیں، لنکا میں تمل اپنی لنکا الگ کرنا چاہتے ہیں۔''

کملیشور کی نگاہ میں پاکستان لفظ علاحدگی پسندی کی علامت ہے۔ جب سے انسانی تاریخ میں نفرت نے جنم لیا ہے تبھی سے علاحدگی پسندی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ تو پتہ نہیں کہ اس نفرت نے پہلا پاکستان کب بنایا لیکن گذشتہ پانچ ہزار برس کی انسانی تاریخ شاہد ہے کہ اس نفرت نے دھرتی کو بار بار ٹکڑوں میں تقسیم کیا ہے۔ سیکڑوں پاکستان وجود میں آچکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ انسانیت سوز نفرت نے ایک ایسی بھیانک کشمکش کو جنم دیا ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ یہ نفرت کبھی مذہب ونسل کے نام پر تو کبھی علاقائیت کے نام پر کشمکش پیدا کرتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ 1947 میں یہ نفرت انتہا پر تھی۔ تقسیم ہند کے دوران انسانیت کی تباہی اور وحشت کے ننگے ناچ کا ذکر سن کر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے لیکن صورت حال دیکھ کر لگتا ہے کہ انتہا پسندی ہنوز باقی ہے۔ ناول نگار کی فکر یہی ہے کہ یہ سلسلہ اب کہیں پر تو جا کر رکے۔

حصول اقتدار اور نجی مفادات کی خاطر انسانیت کا قتل کرنے میں جہاں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی گئی، اس طرح کے واقعات ناول میں تسلسل کے ساتھ موجود ہیں۔ ناول میں عہد مغلیہ کا ایک منظر نامہ ملاحظہ کریں جو عبرت ناک ہے— '' جلوس جب گزر رہا تھا تب دلی کے عوام کا غصہ آنکھوں کے گڑھاؤں میں ابل رہا تھا اور ان کی غمزدہ سانسوں کو جھلسانے والی آندھیوں نے راجدھانی کے پورے علاقے کو اپنی زد میں لے لیا تھا...... جب عوام کی داراشکوہ سے محبت کی اس آندھی نے اورنگ زیب کو گھیرا اور خاموش تردید کے اس طوفان کی خبر ملی تو وہ اندر ہی اندر کانپ اٹھا تھا...... یہ بیان کلجگ کا تھا...... اورنگ زیب کو لگا کہ عوام بغاوت کر سکتے ہیں اور داراشکوہ کی زندگی اور آزادی کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں، تو وہ فکر مند ہو گیا...... اسے لگ رہا تھا جیسے اپنے اعمال کے ملبے میں دب گیا ہو۔

— 'یا اللہ' چیختے ہوئے اورنگ زیب اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کمرے کی دیوار سے ٹکرایا تو روشن آرا نے آکر اسے سنبھالا— 'اے میرے خوش بخت بھائی! یہ وقت کشمکش اور وہم کا نہیں، یہ وقت فیصلہ کن چوٹ کا ہے۔ تمھیں تاریخ نے یہ موقع دیا ہے جو دنیا میں اس وقت کسی کو حاصل نہیں۔ اس لیے اپنی روح کے رستے اس پسینے کو پونچھو اور داراشکوہ پر فیصلہ کن وار کرو۔'

— 'آپا' اورنگ زیب نے کراہتے ہوئے کہا— 'آپا! میں کیا کروں...... بھائی جان داراشکوہ کو کوئی بھی سزا دیتے میری روح کانپتی ہے۔ ہندوستان کے سارے عوام اسے چاہتے ہیں۔ آج کے موجودہ ماحول کی جو اندرونی خبریں مجھے ملی ہیں وہ ہولناک ہیں اور ہندوستان...... خاص طور سے دلی کے عوام کبھی بھی میرے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔'

— 'تو پھر اس بغاوت کو دبانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔' روشن آرا نے کہا۔

— 'کیا؟'

— 'یہی کہ ہندوستانی عوام کی مذہب پرستی اور مذہب کے لیے ان کی بنیادی کمزوری کا تم اس نازک موقع پر فائدہ اٹھاؤ۔' روشن آرا نے اسے مشورہ دیا۔

— 'کیسے...... کیسے؟' اورنگ زیب نے اپنی مدھم اور لگ بھگ خاموش آواز میں پوچھا۔

— 'وہ ایسے کہ داراشکوہ کے خلاف کافر اور غیر موحد ہونے کا الزام لگا کر علما سے اسے سزائے موت کا فتویٰ جاری کرادو۔' روشن آرا نے مشورہ دیا۔

— 'لیکن ایسا فتویٰ جاری کرانا کیسے ممکن ہوگا؟' اورنگ زیب نے جاننا چاہا۔

— 'میں ان ملا، مولویوں اور علما کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ یہ عرب اور ایران نہیں ہے۔ یہ ہندوستان ہے اور یہاں شاہی حکومت کے سامنے انھوں نے ہمیشہ دم ہلائی ہے۔' روشن آرا نے کہا 'تم ابھی ان کی میٹنگ بلاؤ اور اپنا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے دارا کی زندگی کے بارے میں بہت ہی شائستگی سے فیصلے کا حق انھیں سونپ دو اور تم دیکھنا کہ ان کا فیصلہ وہی ہوگا جو تمھارا اور میرا فیصلہ ہے۔'

اس قدر خوب صورتی سے مذہب کا استحصال انسانی تاریخ میں کئی مقامات پر ہوا ہے۔ یہ ناول دراصل ایک عدالت ہے اور منصف کی کرسی پر ایک ادیب براجمان ہے۔ تاریخ کے اہم ترین کردار اس عدالت میں حاضر ہو کر اپنا اپنا

بیان درج کراتے ہیں، تمام تاریخی، تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی واقعات اس عدالت میں اپنے اپنے تصادم اور ٹکراؤ کی داستان بیان کرتے ہیں۔ ادیب یعنی منصف ان کردار و واقعات سے صرف جرح کرتا ہے۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں سناتا۔ فیصلہ تو اب اس عدالت کی داستان پڑھنے اور سننے والوں کو کرنا ہوگا۔ فیصلہ انھیں کرنا ہے جو آج بھی واقعات اور حقیقی مسائل سے دو چار ہیں۔ کملیشور نے نہایت جرأت مندی کے ساتھ عالم انسانیت کو اس کا زخم زدہ چہرہ دکھا دیا ہے۔ اس چہرے کے زخم بھر بھی جائیں تو بھی داغ چھپائے نہیں جا سکتے۔ لہٰذا نیا چہرہ بنانا ضروری ہو گیا ہے۔ انسانیت کا ایسا نیا چہرہ جس کی آنکھوں میں نفرت و تعصب کا ٹھکانہ نہ ہو جس کے ہونٹوں پر قومیں اور مذاہب نغمہ خواں اور تہذیبیں مسکراتی ہوں۔ کملیشور وسدھیو ککٹم یعنی ''ساری دھرتی ایک خاندان'' کے ہندوستانی نعرے کو حقیقت میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ یہ آرزو صرف کملیشور کی ہی نہیں دنیا کے بے شمار دردمند انسانوں کی بھی ہے۔ کملیشور نے ان سب کو زبان دی ہے۔ ان کے ناول کی کردار سلمیٰ کراچی میں بیٹھ کر بانگ دہل کہتی ہے۔— ''جناح صاحب نے تاریخ نہیں بنائی تھی۔ تاریخ نے جناح صاحب کو بنایا تھا۔ اپنی تاریخ سے سبق لیجیے۔ اس کی دیگ کو مذہب کے چولھے پر مت چڑھائیے۔ نہیں تو پھر وہی حال ہوگا جو تقسیم کے وقت ہندوستان کا ہوا تھا اور آج پاکستان کا ہو رہا ہے۔'' ممتاز دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ''کتنے پاکستان'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔
''وقت کے اس اندھیرے سے کملیشور نے اس سچ کو ہمارے حوالے کر دیا ہے کہ ہم چاہیں تو اس سچ کی روشنی میں اپنے مستقبل کا منظرنامہ ترتیب دے سکتے ہیں۔'' پروفیسر موصوف آگے لکھتے ہیں— ''معلوم نہیں کملیشور نے کتنے برس انسانیت کے اس اتھاہ درد کو اپنے اندر بھگتا ہوگا۔ نیل کنٹھ کی طرح اس کا زہر پیا ہوگا اور پھر اسے تخلیق کے امرت میں بدلا ہوگا۔ کملیشور اس تخلیقی پل صراط سے نہایت کامیابی اور ادبی حسن کاری سے گزرے ہیں، جس کے لیے بڑی ریاضت، بڑی پامردی، بڑی تپسیا، بڑے تیاگ اور حد درجہ محنت و ہمت اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ یہ اتنا بڑا کام ہے اور اتنے بڑے کینوس پر کیا گیا ہے کہ یگوں یگوں زندہ رہے گا اور اس کی داد زمانہ دے گا۔''

انسانی ارتقا کے ابتدائی عہد سے اس افسانہ نما حقیقی داستان ''کتنے پاکستان'' کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ داستان تاریخی واقعات و واردات کے تسلسل کی پابند نہیں ہے۔ محض وقت کی عدالت معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کوئی واقعہ، کردار یا تصادم خود اپنا کرب لے کر اس عدالت میں حاضر ہوتا ہے تو کبھی کسی واردات یا شخص کو طلب کر لیا جاتا ہے۔ ظلم و جبر، بھوک اور وحشت، تشدد و تکلیف، تمدن و تہذیب، مذہب و عقیدت، حکمت و سیاست، قتل و غارت گری، تاریکی و تنہائی اور ذہنی و جسمانی کشمکش کے ساتھ ساتھ امن و سکون کی خواہش کا بوجھ اٹھائے انسانی کارواں آگے بڑھ رہا ہے۔ لہولہان حقائق کبھی سر دھنتے ہیں تو کبھی چیختے چلاتے اور روتے ہیں۔ ادیب کی آنکھوں کے سامنے سچائی کا ایک سمندر موجزن ہے۔ کیا ان سچائیوں کے باطن سے وہ سورج نکل سکتا ہے جو انسانیت سوز تاریک حال کو روشن کر کے مستقبل کو پرامن اور خوشحال بنا دے۔ انسان کو چین، عرب، امریکہ، پاکستان یا ہندوستان کا باشندہ نہیں بلکہ اس دھرتی کا باشندہ بنا دے۔ اس کی شناخت رنگ و نسل، مذہب و علاقہ تہذیب و زبان سے نہیں بلکہ انسانی اعمال و اقدار سے ہو۔

وقت کی اس عدالت میں عابد و معبود، جابر و مجبور، استاد و شاگرد، شاہ و گدا، خاص و عام سبھی ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ حاکم انگریز اور غلام ہندوستانی سمیت گاندھی اور جناح دونوں ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔ عدالت صرف بیان ہی نہیں سنتی جرح ہی نہیں کرتی بلکہ واردات و حقائق پر قہقہہ زن بھی ہوتی ہے۔

اس عدالت میں زندہ افراد کی ہی نہیں مردہ لوگوں کی بھی زبردست بھیڑ ہے۔ ان مردوں میں ترشول دھاری بھی ہیں۔ ایک ترشول دھاری چیختا ہے—
''ہماری غلامی کی تاریخ بابر سے شروع ہوتی ہے۔''
''— نہیں ہماری غلامی کی تاریخ انگریزوں کے آجانے سے شروع ہوتی ہے۔'' بھاگلپور کا ایک بڈھا چلایا۔ ''انگریزوں نے ہماری سلطنت بہادر شاہ ظفر سے چھینی تھی۔ وہ جب گئے تو ہماری سلطنت ہمیں سونپ کر جانا چاہیے تھا۔ بابر تو غازی تھا۔''
''— بابر درندہ تھا۔ اس نے آتے ہی اجودھیا میں ہمارا رام جنم بھومی مندر توڑا تھا اور وہاں بابری مسجد بنائی تھی۔ پاکستان بننا تو اسی دن سے شروع ہو گیا تھا۔'' ترشول دھاری بھڑکا۔
''— یہ غلط ہے۔'' میرٹھ کا ایک ادھیڑ چیخا۔
''— یہ صحیح ہے۔'' ترشول دھاری اور بھڑکا۔
عدالت میں عجیب سا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مردوں کی آنکھیں دہشت سے بھر گئیں۔ وہ بدن پر جمے خون کے تھکّے اکھاڑنے لگے۔ اکھاڑنے کے ساتھ ساتھ تازہ خون بھی رسنے لگا۔
''— یہ تازہ خون کہاں سے آیا؟ تمھارا تو خون ہو چکا ہے۔''
''— یہ بابر کی رگوں سے آیا ہے۔'' ترشول بہت جوش میں تھا۔ اس کے جوش سے اوروں کے چہرے کالے پڑتے جا رہے تھے۔
''— سرکار! جب تک بابر کا نام لیا جاتا رہے گا۔ صدیوں کا خون رستا رہے گا۔'' اردلی نے ادیب سے کہا۔
— ادیب سوچتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ

منصف کی کرسی پر تو بیٹھا تھا لیکن یہ نشست دکرمادتیہ کی تو تھی نہیں کہ کوئی پتلی نکل کر اسے کوئی راستہ بتا سکتی۔ راستے کی تلاش تو اسے خود کرنی تھی اور اپنے وقت میں کرنی تھی۔ وقت کو وہ پھیلا سکتا تھا۔ وقت کو وہ سمیٹ سکتا تھا۔ آخر اپنے دماغ پر زور ڈال کر اس نے حکم دیا۔

''—بابر کو عدالت میں حاضر کیا جائے۔''

''تاریخیں، تہذیبیں، افراد، مقامات اور وقت عدالت میں حاضری دیتے ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں اس کا اصل چہرہ ہوتا ہے۔ ہر چہرہ خون میں لتھڑا، گرد آلودہ بے چین، غم زدہ اور اپنی اصلیت اجاگر کرنے کے لیے بے قرار۔ خون اور خاک کی موٹی موٹی تہوں کے نیچے سے چیختے چلاتے ان چہروں کی بے قراری دراصل کملیشور اور ان جیسے دردمند انسانوں کی بے قراری ہے جو خود تاریخوں اور تہذیبوں کا قصۂ پارینہ بن جانے سے قبل اس دنیا کا صاف ستھرا اور نیا چہرہ دیکھ لینا چاہتے ہیں تاکہ پھر کسی شبلی نعمانی کو وقت کی عدالت کی یہ جھڑکی نہ سننی پڑے— دوستو! مجھے لگتا ہے کہ بابر اور ہمایوں کی پشیمانی اور رنج کی مجسم شکل— اکبر اور جہانگیر و شاہجہاں کی پشیمانی کا نتیجہ تھا— دارا شکوہ! لیکن مشکل یہ ہے کہ ملوکیت کی کوئی مذہبی تنظیم، کوئی مذہبی تحریک کسی رنج و پشیمانی کو قبول نہیں کرتی کیونکہ دھرم یا مذہب زندگی کی سچائیوں سے ہمیشہ صدیوں پچھڑا رہتا ہے اور یہی سب کچھ بے بنیاد پاکستانوں کی بنیاد بنتا ہے..... حضرت شبلی نعمانی جیسے لوگ ہی ان غیر فطری پاکستانوں کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ مصر، تیونس، ترکی، صومالیہ، الجیریا، لبنان اور عراق میں کیا ہو رہا ہے؟ وہاں تو مسلمان ہی مسلمان سے لڑ رہا ہے۔ تو شبلی نعمانی صاحب! یہ لڑائی دھرم کی نہیں، دھرم اور مذہبی کٹر پن کی ہے۔ اسلام جیسا مذہب ہی خود اپنے مذہبی کٹر پن سے لڑ رہا ہے اور شاید دنیا کے ہر مذہب کو اپنے کٹر پن سے لڑنا اور اسے جیتنا پڑے گا۔ آپ اپنے مذہبی کٹر پن کے دلائل سے پاکستان میں سے اور پاکستان بنائیں گے، لیکن مذہبی دنیا اپنے مذہبی عقائد کو زندہ رکھتے ہوئے ایک انسانی مذہب کے آئین کا تصور کرے گی۔ یہ کسی ایک مذہب کی دنیا نہیں ہوگی۔ یہ کثیر مذہبی لوگوں کی ایک مذہبی دنیا ہوگی۔ اپنے اپنے مذہب کے کٹر پن سے لڑتے رہنے والے مذہب پرست لوگوں کی دنیا۔''

''کتنے پاکستان'' کا مطالعہ اصل میں ہزاروں سالہ انسانی تاریخ کے تمام نشیب و فراز سے پورے شعور و ہوش کے ساتھ گزر جانے کے مترادف ہے۔ انسانیت کے دکھ کی یہ داستان اس نئے اور اچھوتے انداز سے پیش کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کے لیے بھی ایک نیا اور اچھوتا تجربہ لگتا ہے۔ مہاتما بدھ اور مرزا غالب بھلے ہی اس دکھ کا علاج دنیا سے فرار یا موت بتائیں لیکن حقیقت پسندی اور سائنس کے اس دور میں اس بھیانک دکھ کا علاج زندگی ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا زندگی کی تلاش بے حد ضروری ہے۔ کملیشور نے دنیا کے تمام فکرمند انسانوں کو 'کتنے پاکستان' دے کر زندگی کی تلاش کی مہم کا شاندار آغاز کیا ہے۔ ایسا آغاز جو خواب و خیال پر نہیں بلکہ سچائی اور صداقت پر مبنی ہے۔

□□□

پتہ:
House No. 23, Gali No. 14-B
Koushik Enclave, Burari Extn.
Delhi-110084

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کی اس کتاب میں جو جدیدیت اور نئے فکری اور فلسفیانہ میلانات کے سیاق میں حوالے کی حیثیت رکھتی ہے وجودیت اور مارکسیت سمیت ادب، زبان اور آرٹ سے تعلق رکھنے والے تمام اہم مکاتب فکر اور تصورات سے بحث کی گئی ہے۔ ادب میں قدیم و جدید کی کشمکش اور نئے طرز احساس و اظہار کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔

صفحات: 292، قیمت: -/114 روپے

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

اردو میں جب جدیدیت کے رجحان نے زور پکڑا اور اس وقت کے نئے لکھنے والوں میں اسے غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی تو اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے موافق اور مخالف دونوں طرح کی آرا کو سامنے رکھ کر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

صفحات، 239، قیمت: -/96 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110 066

ابوبکر عباد

بنگال نشاۃ ثانیہ اور اردو

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد کلکتہ ایک بار پھر تب دنیائے اردو کے لیے بحث کا موضوع اور ذوقِ مطالعہ و مشاہدہ کو جلا بخشنے کا باعث بنا جب مرزا غالب نے کلکتے کا سفر کیا۔ اس سفر کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ کلکتے نے غالب کی سوچ وفکر میں زبردست انقلاب برپا کیا۔ غالب کا اردو کلام ہو یا فارسی اگر غالب کلکتہ نہ آتے تو ان کا کلام اتنا تہہ دار، اتنا جدید اور انداز بیاں ایسا دلنشیں نہ ہوتا۔ اس وقت دلی سے سیکڑوں میل دور کلکتے میں ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی جس کا مطالعہ غالب نے بہت ہی قریب رہ کر اور توجہ سے کیا۔ وہ اتنے ذہین وفہیم اور حساس تھے کہ انھوں نے نہ صرف مستقبل کے ہندوستان کو پہچان لیا بلکہ خاطر خواہ اس کا استقبال کیا اور نئے عہد کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی شعوری کوششیں بھی کیں۔

ایک روایت کے مطابق ''آئین اکبری'' پر جب سرسید نے چاہا کہ غالب تقریظ لکھ دیں، تو روشن خیال غالب نے ان سے کہا کہ ''آئین اکبری'' کا قصہ لے کر کہاں بیٹھ گئے، اب جو نیا آئین آ رہا ہے وہ گذشتہ تمام آئین سے کہیں زیادہ جامع اور نافع ہے۔ روایت یہ بھی ہے کہ ماضی کی بازیافت کر رہے سرسید کو یہ بات ناگوار گزری اور ایک عرصے تک دونوں کے تعلقات کشیدہ رہے۔ صلاح و صفائی کی صورت اس وقت پیش آئی جب غالب رام پور سے واپسی میں مرادآباد ٹھہرے اور سرسید کے مہمان ہوئے۔ ڈاکٹر نسیم انصاری کا خیال ہے کہ غالب کے مشہور قطعے کا یہ شعر:

ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

کلکتے سے متعلق ہے اور اسی قطعہ میں 'دامانِ باغباں' اور 'کفِ گل فروش' کا غالب نے جو ذکر کیا ہے، ان کی مراد اسی شہر سے تھی۔ اپنے معترضین سے غالب کا مجادلہ اور نتیجتاً اپنی غریب الوطنی اور وہاں کے لوگوں کی نامہربانیوں کی شکایت پر مبنی ان کی مثنوی 'بادِ مخالف' کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے لیکن اپنے خطوط میں انھوں نے جی کھول کر کلکتے کی تعریف بھی کی ہے اور کلکتے کی یاد سے متعلق ان کا یہ شعر تو زبان زد ہے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

لالہ سداسکھ کی ادارت میں اردو کا پہلا ہفت روزہ اخبار ''جامِ جہاں نما'' کلکتے سے جاری ہوا، لیکن اس بات کا شاید کم لوگوں کو علم ہو کہ برصغیر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے قبل کلکتہ یونیورسٹی نے اپنے یہاں اسلامیات کی تعلیم شروع کرنے کا اہتمام کیا تھا اور اس وقت حکومت نے اس کے معلم کی تنخواہ پانچ ہزار ماہانہ مقرر کی تھی، جب کہ اس عہدے کے اساتذہ کی تنخواہیں بالعموم ہزار ڈیڑھ ہزار روپے ہی ہوا کرتی تھیں۔ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوبکر شیث اور علامہ سعد اللہ پر مشتمل سلیکشن کمیٹی نے بہ اتفاق رائے اس عہدے کے لیے جس امیدوار کو منتخب کیا تھا وہ کوئی مسلمان عالم و فاضل نہیں بلکہ تمام امیدواروں میں فوقیت رکھنے والا علومِ اسلامیہ کا ماہر ایک یہودی نوجوان تھا۔ ہندوستان میں اگر کہیں نشاۃ ثانیہ ہوئی ہے تو اس کا تعلق بنگال سے ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ بنگالی نشاۃ ثانیہ دراصل ہندو بنگالیوں کی نشاۃ ثانیہ تھی اور اس کے رکنِ رکین تھے مغل بادشاہ اکبر ثانی سے 'راجہ' کا خطاب پانے والے راجہ رام موہن رائے، جن کا عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ جب مشنری کی طرف سے ہندو روایات کے ساتھ ساتھ ہندو عقائد پر حملے کیے جانے لگے اور عیسائی مبلغوں نے ہندوؤں کو عیسائی بنانا شروع کیا تو راجہ رام موہن رائے نے ایک وفادار ہندو کی حیثیت سے ہندوؤں کی اصلاح کے لیے ایک زبردست تحریک چلائی جو تاریخ میں ''برہمو سماج'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس تحریک کا مقصد ان روایات کا احیا تھا جو فراموش کر دی گئی تھیں اور چند غیر مہذب اور غلط رسم و رواج کی اصلاح بھی مقصود تھی مثلاً 'ستی' 'بچپن کی شادی' اور عورتوں کو غیر تعلیم یافتہ رکھنا وغیرہ۔ راجہ رام موہن رائے کے علاوہ سوامی دویکانند کا نام بھی اہم ہے جنھوں نے قدیم ہندو تصورات کی ایسی مدافعت کی، کہ ویدک تعلیمات کا وقار پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔

اقتدار حسین صدیقی کے مطابق ''نشاۃ ثانیہ اصطلاح کا استعمال اسلامی روایات کے سلسلے میں کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کی روایت کبھی بھی گم گشتہ روایت نہیں تھی جس کا احیا ہوتا'' (ششماہی 'تسلسل' جموں

یونیورسٹی، جنوری۔ جولائی 2005:ص۔18) اور اگر نشاۃ ثانیہ پر اصرار اتنا ہی ضروری ہے تو 1857 کی جنگ آزادی کے بعد شاہ ولی اللہ کی تحریک کو نشاۃ ثانیہ قرار دینا چاہیے جو تین متوازی دھاروں میں منقسم ہوگئی اور دیوبند تحریک، اہلِ حدیث تحریک اور علی گڑھ تحریک کے ناموں سے موسوم ہوئیں، جن کے بانی بالترتیب مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا نذیر حسین اور سرسید احمد خاں ہیں۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو نہ صرف جینے کا حوصلہ بخشا بلکہ انھیں باعزت زندگی گزارنے کا سلیقہ اور سربلند رہنے کے انداز بھی سکھائے۔ مسلمانوں کی مذکورہ نشاۃ ثانیہ میں علی گڑھ تحریک اور سرسید کے ساتھ ساتھ بنگال کے سرسلیم اللہ نواب، امیر علی، شیر بنگال فضل الحق اور ہوڑہ کے مولوی محسن کی گراں قدر خدمات کا بھی اعتراف کیا جانا چاہیے، کہ ان شخصیات نے بھی وقت کی ضرورت کے مطابق عیسائی حملوں سے مذہب اسلام کی مدافعت کی تھی، اسلامی عقائد کا ادعا کیا تھا اور مسلمانوں کی تہذیب یاد دلا کر غافلوں کو بتایا تھا کہ کبھی ہم بھی اسی محفل رنگ و بو کے مسند نشیں رہ چکے ہیں۔ جہاں تک بنگالی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا تعلق ہے تو اس کا بڑا اور اہم نام فضل الحق ہے۔ بنگال کے مسلمانوں میں ان کی حیثیت راجہ رام موہن رائے اور سوامی وویکانند سے کسی طور کم نہیں، بنگال کے عام مسلمانوں کو باعزت بنانے کا سہرا انھی کے سر جاتا ہے۔ انھوں نے کلکتہ میں اسلامیہ کالج اور لیڈی بریبورن کالج قائم کر کے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم اور بہتر تربیت کا انتظام کیا، کرشک پرجا پارٹی بنا کر ہندو اور مسلمانوں کو سیاسی میدان میں شانہ بشانہ چلنے کے گر بتائے اور زرعی اصلاحات کے ذریعے غریب کسانوں کو جان لیوا محصول اور قرض کے بوجھ سے نجات دلائی۔

بنگال کی مسلم تہذیب ایک نئے عہد سے آشنا اس وقت ہوئی، یا یوں کہیے کہ اس پر شباب تب آیا جب ہندوستان عملی طور پر دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ وہاں کے مسلم نوجوان جو اس وقت تک فنونِ لطیفہ سے ذرا الگ تھلگ اور قدرے ڈرے سہمے رہتے تھے اب موسیقی، ادب اور سائنس کے میدان میں ایک نئے جوش وخروش کے ساتھ داخل ہونے لگے۔ اس غیر متوقع صورت حال سے نالاں چند قدامت پسند بزرگوں نے انھیں نصیحت کرنے کی کوشش کی کہ میاں ایسی باتوں سے دور رہو، کیا تم نہیں جانتے کہ آدمی ان باتوں سے لامذہب ہوجاتا ہے لیکن نئی نسل کے ان متوالوں کی دلیل تھی کہ امیر خسرو، خواجہ حافظ شیرازی، عمر خیام اور شیخ سعدی کی وجہ سے تو کسی کا مذہب نہیں گیا، اور پھر اگر مسلمان عربی کے بجائے فارسی، ہندی اور انگریزی زبانیں بول کر بھی اسلام کو بچائے رکھ سکتے ہیں تو پھر بنگلہ زبان نے کیا قصور کیا ہے؟ جیسے انگریز شیکسپیئر اور اہل عرب امراءالقیس اور متنبی کو اپنا شاعر تسلیم کرتے ہیں ویسے انھوں نے بھی رابندر ناتھ ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام کے نغمے الاپنا شروع کر دیے۔ غالباً ہندوستان کے کسی خطے کے لوگوں کو نشاۃ ثانیہ کی اتنی قیمت نہیں چکانی پڑی جتنی بنگال کے مسلمانوں کو۔ ہمیں ان لوگوں کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے یہ قیمت ادا کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس قضیے کو ختم کر دیا کہ کوئی پہلے مسلمان ہے یا ہندوستانی۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ''فسانۂ آزاد'' سے متعلق دعویٰ کیا تھا کہ اردو زبان میں انگریزی طرز پر لکھا ہوا یہ سب سے پہلا ناول ہے، لیکن ساتھ ہی انھوں نے اپنے ایک نایاب مضمون بعنوان ''ناول نگاری'' (مشمولہ 'دبدبۂ آصفی' حیدرآباد جمادی الثانی 1315ہجری) کے شمارے میں یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ ''سب سے پہلے انڈیا میں انگریزی اصول پر اہل بنگال نے اپنی بنگلہ زبان میں ناول لکھے۔ اور رائے بنکم چندر چٹرجی نے اس فن کی گھوڑ دوڑ میں بازی جیت لی۔'' اس عہد میں بنگال میں اردو کا کوئی ایسا بڑا یا قابل ذکر فکشن نگار نہ تھا جو بنگلہ یا انگریزی سے مستفیض بنگلہ ادب سے فائدہ اٹھا کر اردو فکشن نگاری کے ارتقائی مراحل میں تعاون دیتا، اگرچہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا خیال ہے کہ ''مجموعی طور پر اردو ناول کے ارتقا اور ترقی میں بنگلہ زبان کے ناولوں نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔'' اسی طرح مظفر اقبال اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ''ریاست بہار میں ناول نگاری کی ابتدا بنگلہ ناولوں کے زیر اثر ہوئی، اور نذیر احمد کے ناولوں کا اثر یہاں کے مصنفوں نے بہت بعد میں قبول کیا۔'' جن لوگوں نے اردو یا بہار میں لکھے گئے ابتدائی ناولوں کا مطالعہ کیا ہے ان کے لیے ان دونوں خیالات سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ البتہ اردو فکشن میں بنگال کی تہذیب وتمدن، وہاں کی سیاسی سماجی اور معاشی زندگی کی جھلک کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً متعدد افسانہ نگاروں کے یہاں ملتی ہے، بالخصوص ل. احمد اکبرآبادی، سہیل عظیم آبادی، اختر حسین رائے پوری، کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر وغیرہ کے یہاں۔ ان لوگوں نے بنگال، بنگال کے گاؤں محلے، رہن سہن، بنگالیوں کا علم و ادب سے لگاؤ، سنگیت، مصوری اور تھیٹر سے ان کی دلچسپی، اپنے ادیب و شاعر کی تخلیقات پر ان کا ناز، سیاست سے تعلق، بحث ومباحثے کا شوق اور بنگالی ہندو مسلمان کے مختلف طبقوں کے کردار کو جس کثرت اور عمدگی سے پیش کیا ہے، اس کی مثال خود بنگلہ میں ہو تو ہو اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں مشکل سے ملے گی۔

برصغیر کے رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے بنگال کے شعرا و ادبا کی تخلیقات اور ان کے مجموعوں کی تعداد قابل لحاظ اور ان کا معیار اطمینان بخش ہے۔ یوں تو بنگال میں اردو کے محققوں، نقادوں، شاعروں، ڈرامہ نگاروں،

مورخوں اور افسانہ نگاروں کی کمی کبھی نہیں رہی، لیکن جدیدیت کے آخری زمانے کو بنگال میں اردو افسانے کا اس اعتبار سے عہد زریں کہنا چاہیے، کہ اس عرصے میں نوجوان افسانہ نگاروں کا ایک ایسا تازہ دم کارواں شاہراہِ ادب پر نمودار ہوا جو گوناگوں اور متضاد صفات کا حامل تھا۔ اس کارواں کے چند روشن اور ممتاز چہرے ہیں: ظفر اوگانوی، اظہار الاسلام، انیس رفیع، مشتاق انجم، شبیرہ مسرور، صدیق عالم اور شبیر احمد وغیرہ، جنھوں نے اردو فکشن کے سرمائے میں متعدد خوب صورت کہانیوں اور ناولوں کا اضافہ کیا۔

کلکتہ نے جہاں ''جامِ جہاں نما'' سے اردو صحافت کی تاریخ کا آغاز کیا وہیں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار ''الہلال'' اور ''البلاغ'' نے صحافت کو ناموری، آبرو اور اعتبار بخشا۔ اس روایت کے امین احمد سعید ملیح آبادی ہیں جس کا ثبوت روزنامہ ''آزاد ہند'' کے صفحات اور اس کے مخصوص اداریے ہیں۔ یہ شہر آج بھی ایک معنی میں ہندوستان کا تہذیبی دارالخلافہ ہے۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے تو کلکتہ ہمیشہ سے اردو کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ حالانکہ دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، علی گڑھ اور ممبئی وغیرہ کے مقابلے میں اس کا ذکر اس حیثیت سے زیادہ نہیں ہوتا، لیکن اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے زمانے سے لے کر آج تک اردو کے شاعر و ادیب، ڈرامہ نگار، محقق و نقاد اور مترجمین اردو زبان و ادب کو ثروت مند بناتے رہے ہیں۔

کلکتہ میں آج بھی شاعر و ادیب، ڈرامہ نگار اور ناقدین کی ایک کہکشاں ہے جس میں اعزاز افضل، شہناز نبی، یوسف تقی، ظہیر انور، خواجہ نسیم اختر، قیصر شمیم، ناظم سلطان پوری، شمیم انور، کمال احمد، ف.س. اعجاز، نعیم انیس، قاصر کرم پوری، نوشاد مومن، کلیم حاذق اور عاصم شاہنواز شبلی جیسے ادب نواز اردو زبان و ادب کو زندہ رکھنے اور اس کی مختلف اصناف کے گیسو سنوارنے میں مصروفِ عمل ہیں۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu
University of Delhi
Delhi-110007.

دل کی گیتا

مدوّن: مخمور سعیدی

''شریمد بھگوت گیتا'' ہندستان کا وہ الہامی صحیفہ ہے جس کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کے تراجم ہوتے رہے ہیں لیکن خواجہ دل محمد کا یہ ترجمہ گیتا کا بہترین ترجمہ ہے جو اردو نظم میں کیا گیا ہے۔ ترجمے میں بہت سے مقامات پر کثیر المعانی الفاظ آئے ہیں، خواجہ صاحب نے ایسے تمام مقامات پر حاشیے میں وہ معنی درج کر دیے ہیں جو وہاں مطلوب ہیں۔ جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے حواشی میں مطالب کی تفسیر و توضیح بھی کرتے گئے ہیں۔

صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے

خواجہ میر درد

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالاتِ زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔ 110 066

محمد عرفان

ترانۂ اردو

سب سے اچھی سب سے میٹھی، سب سے سہانی اردو ہے
جگ میں لاکھوں لاکھ زبانیں، اردو رانی اردو ہے
فقرہ فقرہ اکبرِ اعظم مصرع مصرع نور جہاں
بیجا پور، میسور سے تا کشمیر ہیں جس کے نام و نشاں
لہجہ لہجہ تاج محل ہے، شاہ جہانی اردو ہے
جگ میں لاکھوں لاکھ زبانیں، اردو رانی اردو ہے
اس میں سب پھولوں کی خوشبو، سب پھولوں کی رنگت ہے
سب قدموں کی چاپ ہے اس میں، سب قوموں کی سنگت ہے
ہندستان کی کوکھ سے جنمی، ہندستانی اردو ہے
جگ میں لاکھوں لاکھ زبانیں، اردو رانی اردو ہے
عید کرسمس ہولی دوالی، سب تہوار ہمارے ہیں
آنکھ کی ٹھنڈک دل کی رونق یہ سارے نظارے ہیں
سچے پرکھوں کا ورثہ ہے، سچی بانی اردو ہے
جگ میں لاکھوں لاکھ زبانیں، اردو رانی اردو ہے
صوفی سنتوں اور ولیوں نے اس کا باغ لگایا ہے
خسرو جیسے فنکاروں نے اس کا ساز بجایا ہے
بھگتی کال کے دوہوں والی، پریم دوانی اردو ہے
جگ میں لاکھوں لاکھ زبانیں، اردو رانی اردو ہے
اردو ہے دھمیش کی بولی، اردو امرت دھارا ہے
اردو کا جو لفظ ہے گویا ناتک کا گرودوارا ہے
گیان سریتا کہلاتی ہے، بڑی گیانی اردو ہے
جگ میں لاکھوں لاکھ زبانیں، اردو رانی اردو ہے
عشق و وفا کے قومی نغمے اردو گاتی آئی ہے
عشق و وفا کے نام پہ اردو دھوم مچاتی آئی ہے
عشق و وفا جتنے ہیں پرانے اتنی پرانی اردو ہے
جگ میں لاکھوں لاکھ زبانیں، اردو رانی اردو ہے
ملتی ہے اوراقِ غزل میں روز گلابوں کی مانند
بند کھلی آنکھوں میں اردو پیار کے خوابوں کی مانند
ایک حقیقت ایک فسانہ ایک کہانی اردو ہے
جگ میں لاکھوں لاکھ زبانیں، اردو رانی اردو ہے
اردو اک تحفہ ہے نرالا اردو اک گلدستہ ہے
اردو ہے تہذیب کی منزل اردو سچا رستہ ہے
سب کے من کو جیت چکی ہے وہ من مانی اردو ہے
جگ میں لاکھوں لاکھ زبانیں، اردو رانی اردو ہے
آجائے جس وقت زباں پر زور دکھا کر رہتی ہے
نفرت سے ٹکرائے تو دیوار گراکر رہتی ہے
ایک تلاطم، ایک سمندر، ایک روانی اردو ہے
جگ میں لاکھوں لاکھ زبانیں، اردو رانی اردو ہے
اردو بھاشا ایک خزانہ آزادی کی بولی کا
اردو نے ہی توڑ کیا تھا انگریزوں کی گولی کا
آزادی کی لڑائی لڑی ہے، وہ مردانی اردو ہے
جگ میں لاکھوں لاکھ زبانیں، اردو رانی اردو ہے
اردو اپنا جینا مرنا، اردو کھانا پینا ہے
اردو اپنی روزی روٹی اردو خون پسینہ ہے
اردو اپنا رزق ہے، اپنا دانہ پانی اردو ہے
جگ میں لاکھوں لاکھ زبانیں، اردو رانی اردو ہے
دنیا والو! اس کو بھلانا، اس کو مٹانا کھیل نہیں
بن اردو کے دل والوں میں کوئی محبت میل نہیں
اردو سب سے پیاری زباں ہے سب کی زبانی اردو ہے
جگ میں لاکھوں لاکھ زبانیں، اردو رانی اردو ہے

□□□

پتہ:
Near Electric Transformer
Jama Masjid
Qila, Bareilly (U.P.)

قومی اردو کونسل کی چند اہم مطبوعات

جامع التذکرہ (جلد اوّل)

مؤلف: پروفیسر محمد انصار اللہ

شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف شعرا کے احوال وکوائف سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان میں شامل انتخاب کلام سے ان شعرا کی درجہ بندی اور ان کی ادبی قدر و قیمت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے اردو تنقید کا اولیں نقش بھی ہیں۔ پروفیسر محمد انصار اللہ نے بڑی محنت سے اردو اور فارسی تذکروں میں شامل مختلف شعرا سے متعلق مواد کو حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔

صفحات: 384، قیمت -/140 روپے

بحر الفصاحت (دو جلدوں میں)

مصنف: حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری

تدوین: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

"بحر الفصاحت" نظم ونثر کے محاسن اور معائب پر ایک اہم کتاب ہے جو اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1885 میں رام پور کے مطبع سرور قیصری سے اور دوسری اور تیسری بار مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ سے بالترتیب 1917 اور 1926 میں شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن 1926 کے ایڈیشن پر مبنی ہے۔

صفحات: 1621، قیمت -/730 روپے

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر قمر رئیس

پریم چند اردو کے ایک بڑے ناول نگار ہیں۔ اس کتاب میں پروفیسر قمر رئیس نے ان کی زندگی، ان کے تصور حیات، ان کے عہد اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ یہ کتاب حوالے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ پہلی بار یہ کتاب دسمبر 1959 میں شائع ہوئی تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 424، قیمت -/152 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فلم، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں "آتش پارے"، "منٹو کے افسانے" اور "دھواں" کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت -/285 روپے

کلیات علی سردار جعفری

مرتب: علی احمد فاطمی

قومی اردو کونسل نے قدیم اور جدید عہد کی اہم اردو تصانیف کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھنے اور اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ایک منصوبے کے تحت ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ کلیات علی سردار جعفری اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں "پرواز"، "نئی دنیا کو سلام"، "خون کی لکیر" اور "امن کا ستارہ" اور دوسری جلد میں "ایشیا جاگ اٹھا"، "پتھر کی دیوار"، "ایک خواب اور"، "پیراہن شرر"، "لہو پکارتا ہے" اور بعد کی چند نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

جلد اوّل صفحات: 496، قیمت: 164 روپے
جلد دوم صفحات: 533، قیمت: 200 روپے

کلیات حسن نعیم

مرتب: احمد کفیل

نئی غزل کے پیش روؤں میں حسن نعیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جو بانکپن نظر آتا ہے وہ اردو کی غزلیہ روایت میں انفرادیت کا حامل ہے۔ کلیات حسن نعیم میں ان کی تمام شعری تخلیقات تاریخی ترتیب سے جمع کر دی گئی ہیں۔

صفحات: 335، قیمت -/185 روپے

حالی

مصنف: صالحہ عابد حسین

ایک شاعر، ادیب، نقاد، سوانح نگار کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالی ایک سماجی مصلح بھی تھے۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اصلاح کے لیے شاعری کا سہارا لیا بلکہ شعر و ادب کی کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی اور اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق کی ترغیب دی۔ صالحہ عابد حسین نے حالی کی شخصیت اور زندگی کے تمام گوشے اس کتاب میں اجاگر کیے ہیں۔

صفحات: 68، قیمت -/15 روپے

محمد حسین آزاد

مصنف: نند کشور وکرم

محمد حسین آزاد ہمارے ان اکابرین میں سے ہیں جنھوں نے اردو کی ادبی تاریخ کا رخ موڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ انجمن پنجاب کے ذریعے انھوں نے جدید نظم کو فروغ دینے کے ساتھ آب حیات، دربار اکبری، نیرنگ خیال اور سخندان فارس جیسی اہم کتابیں بھی لکھیں۔ نند کشور وکرم نے اس کتاب میں آزاد کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 79، قیمت: -/18 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

ارون کمار ترپاٹھی

1857 کی جنگ آزادی اور لکھنؤ

1857 کی پہلی جنگ آزادی میں لکھنؤ کا انتہائی بلند مقام ہے۔ بیگم حضرت محل کی قیادت میں خواتین افواج نے یونیورسٹی روڈ چوراہے پر انگریزی افواج کو شکست دی، بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کا سر قلم کرکے خون پینے والے ہڈسن کو اسی جنگ میں ہلاک کیا گیا تھا۔ یہیں پر مولوی احمد اللہ شاہ نے اپنی جنگی مہارت کا مظاہرہ کیا جس کے باعث دہلی کی شاہی حکومت کے خاتمے کے چھ مہینے بعد بھی لکھنؤ میں آزادی کا پرچم لہراتا رہا۔ مولوی احمد اللہ شاہ سرعام شاہی حکومت کے خلاف تقریریں کرتے رہے اور انھوں نے فرنگیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا تھا۔ انگریز پولس نے طاقت کا استعمال کرتے ہوئے ان کے معتقدین کو غیر مسلح کر دیا اور مولوی کو ایک فوجی قید خانے میں قید کر دیا۔ ظہیر حسین جعفری کے مطابق ان کی پیدائش انیسویں صدی کے دوسرے دہے میں چن پٹن (مدراس) کے نواب محمد علی خاں کے گھر ہوئی تھی۔ نوجوانی میں ہی نظام حیدرآباد کے مہمان بنے۔ دشمنوں کو فریب دے کر جنگ جیتنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ان کی اس اہلیت سے بادشاہ فوراً متاثر ہو جاتے تھے۔ حیدرآباد کے بعد انھیں لندن جانے کا موقع ملا۔ وہاں جاکر انھوں نے شہنشاہ سے بھی ملاقات کی۔ واپسی میں انھوں نے مکۃ المکرمہ اور مدینۃ المنورہ کی زیارت کی اور عراق وایران کا سفر بھی کیا۔

انگریزوں سے لوہا لینے والے مولوی احمد اللہ شاہ کے یہ نعرے بہت مشہور تھے۔

راہِ عام پر
وطن کے نام پر
چلے چلو......
ہر قوم شانِ ہند
کوئی بڑی نہ چھوٹی
ہندو کے گھر کنول
اور مسلم کے گھر روٹی

چن ہٹ کے قریب اودھ کی پہلی جنگ میں آزادی کے متوالوں نے نہ صرف انگریزوں کو شکست دی بلکہ انھیں یہاں سے نکال کر باہر کر دیا اور ان کا گولہ بارود بھی ضبط کر لیا۔'' فریڈم اسٹرگل ان یو. پی. جلد : 2'' میں کرنل نیل کے پیغام کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ''انگریزوں نے یہاں اپنی شکست کو قبول کیا اور 10 جولائی 1857 کو دوپہر ایک بج کر پچاس منٹ پر پیغام نشر کیا گیا کہ لکھنؤ کے کمشنر ہنری لارنس کی اطلاع کے مطابق چن ہٹ میں ہماری زبردست شکست ہوئی ہے اور ہم وہاں سے بھاگ گئے ہیں۔'' اتر پردیش صوبائی آرکائیوز میں موجود گزیٹیر آف اودھ کے مطابق 30 مئی کی رات نو بجے 84 ویں نیٹو پیدل فوج کے نصف سپاہی، 71 ویں نیٹو پیدل فوج کے نصف سپاہی اور 13 ویں نیٹو پیدل فوج کے کچھ جوانوں نے ساتویں لائٹ گھوڑسوار فوج کی دو ٹکڑیوں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی شروع کی۔ چیف کمشنر ہنری لارنس نے اسے فرو کرانے کے لیے اپنی پوری طاقت جھونک دی۔ انگریزوں کو خبر ملی کہ 8 جون کی رات کو فیض آباد سے فوجی ٹکڑیاں لے کر مولوی احمد اللہ شاہ لکھنؤ کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں اور 30 جون کو ہنری لارنس نے اودھ کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے ککریل نالے کے قریب اودھ کی فوج کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مورخ سرنام سنگھ سوریہ ونشی کے مطابق منگل کے دن صبح چار بجے انگریزی فوجیں چن ہٹ کے لیے روانہ ہوئیں۔ لوہے کے پل (موجودہ ڈالی گنج پل) سے گزرتے ہوئے انگریزوں نے کسانوں اور سبزی فروشوں سے ملکی افواج کے متعلق معلومات حاصل کرنی چاہی، لیکن کسانوں اور سبزی فروشوں نے انھیں غلط اطلاعات فراہم کیں کہ لکھنؤ اور چن ہٹ کے درمیان فوج تو کیا کوئی آدمی بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس اودھ کی افواج چن ہٹ سے مغرب کی جانب خیمہ زن تھی۔'' قریب کے ایک گاؤں اسلام پور سے داہنے ہاتھ پر ایک راستہ تھا اور اسی راستے سے انگریز آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں (اودھ) آزادی کے متوالوں نے مٹی کی دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے برطانوی فوج پر حملہ کر دیا۔ اس حملے سے انگریز گھبرا گئے۔ یہاں انھیں ہندوستانی افواج کے مد مقابل ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔ شدید گرمی اور ہندوستانی فوج کے جوش و ولولے کے سامنے انگریز پست ہو گئے اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کی چار توپیں اور بڑی تعداد میں گولہ بارود بھی وہیں چھوٹ گیا جسے ہندوستانی فوج نے اپنے قبضے میں کر لیا۔

16 نومبر 1857 کو سکندر باغ کی لڑائی میں ایک نامعلوم خاتون نے درخت پر چڑھ کر سینکڑوں فائر کیے۔ ان کے ہاتھوں کئی انگریز ہلاک ہوئے۔ اس نامعلوم خاتون کے متعلق انگریز مصنفین نے بھی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ کرسٹوفر ہبرٹ کی کتاب ''دی گریٹ میوٹنی'' میں ایک نامعلوم خاتون کا ذکر ملتا ہے۔ جنگ کے دوران جب سکندر باغ میں کیپٹن ویلس پیپل کے درخت کے قریب پہنچے تو وہاں انگریزوں کی لاشیں دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔ انھوں نے لاشوں کا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ سبھی کے کندھے یا سر پر ہی گولی لگی تھی۔ یعنی گولیاں بلندی سے چلائی گئی تھیں۔ جب انھوں نے پیپل کے گھنے درخت پر گولی چلائی تو اوپر سے تڑپتی ہوئی ایک انسانی شکل نیچے آگری۔ اس کے سبھی کارتوس ختم ہو چکے تھے۔ نیچے گرنے کی وجہ سے اس کی سرخ جیکٹ کا بالائی حصہ کھل گیا تو معلوم ہوا کہ وہ خاتون ہے۔ کیپٹن ویلس کی آنکھیں بھر آئیں اور انھوں نے کہا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ خاتون ہے تو میں کبھی گولی نہیں چلاتا۔ پاسی سماج کی کتاب ''جدوجہد آزادی میں پاسی سماج کا حصہ'' میں مصنف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ جاں باز خاتون اودا دیوی تھیں۔ وہ پاسی سماج کے عزت دار خاندان چودھری رائے صاحب کی بیٹی تھیں۔ جو ہیویٹ روڈ پر رہتے تھے ان کی شادی اجریا گاؤں کے مکا پاسی کے ساتھ ہوئی تھی، سسرال میں وہ جگ رانی کے نام سے مشہور تھیں۔ ہنری لارنس کی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مکا پاسی بھی شہید ہو گئے تھے۔ 20 جولائی 1857 کو ریزیڈنسی پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ریزیڈنسی کی باہری سرنگوں میں ڈائنامائٹ بھر کر اڑا دیا گیا اور جملہ اطراف سے دشمنوں پر حملہ کیا گیا۔ اس حصار بندی کے دوران چیف کمشنر لارنس اور میجر بینکس کو ہلاک کر دیا گیا۔ 21 اگست کو ہیولاک، جنرل نیل اور آؤٹرم کے ساتھ ایک بڑی فوج لے کر لکھنؤ میں پھنسے انگریزوں کی مدد کے لیے کانپور سے چل پڑا۔ محض 48 میل کا فاصلہ طے کرنے میں انگریزوں کو 33 دن لگ گئے۔ جگہ جگہ اودھ کے عوام سے انگریزوں کی مقابلہ آرائی ہوئی۔ ہیولاک نے قصبات اور دیہات میں آگ لگا دی جس سے کافی تعداد میں عام شہری ہلاک ہوئے۔ مورخ مچل کے مطابق— ''اودھ کی آزادی سے محبت کرنے والے عوام پر ظلم ڈھائے گئے اور انھیں قتل کیا گیا'' 23 ستمبر کو ہیولاک کی فوج عالم باغ پہنچ گئی، جہاں قلعے میں ہندوستانی فوج سے محاذ آرائی ہوئی۔ 25 ستمبر تک ہیولاک ہندوستانی فوج سے مقابلہ کرتا ہوا چار باغ تک پہنچ گیا۔ آج اسی جگہ پر ریلوے اسٹیشن قائم ہے۔ جنگ میں 700 لوگ ہلاک ہوئے۔ ہیولاک کو بھی وہیں قید کر دیا گیا۔ اس طرح لکھنؤ شہر کے ساتھ اودھ کا صوبہ بھی آزاد بنا رہا۔ مورخ انش کے مطابق— ''بہادر انقلابیوں کی حیرت انگیز شجاعت اور بہادری کو دیکھ کر اودھ کے باشندوں کی جنگ کو جنگ آزادی ضرور ماننا ہوگا۔ 9 نومبر کو کیمپبیل بھی لکھنؤ پہنچ گیا۔ منصوبہ بنایا گیا کہ 14 نومبر کو ادھر سے کیمپبیل اور ادھر سے ہیولاک اور آؤٹرم ریزیڈنسی سے نکل کر لکھنؤ پر حملہ کریں گے۔ اس وقت عالم باغ میں باہر سے مزید انگریزی فوج آ گئی جس میں ہیولاک، آؤٹرم، لیوگارڈ، وال پول، ہڈسن، ہوپ گرانٹ وغیرہ مشہور فوجی کمانڈر کیمپبیل کے ساتھ تھے۔ 14 نومبر کو کیمپبیل کی فوج ہندوستانی افواج کا مقابلہ کرتی ہوئی بڑی مشکل سے دلکشا باغ پہنچ سکی اور وہیں رات گزارنے کے بعد 15 نومبر کو سکندر باغ پر حملہ کر دیا۔ آٹھ دن تک زبردست جنگ ہوئی جس میں دو ہزار سے زائد ہندوستانی سپاہی شہید ہوئے۔ مولیسن کے لفظوں میں— ''سندر باغ پر قبضہ بڑا ہی خوں ریز تھا۔ انقلابیوں نے بڑی مستعدی اور جواں مردی سے مقابلہ کیا۔ ایک ایک انچ زمین کے لیے زبردست جنگ ہوئی۔ چاروں طرف بکھری لاشوں سے پتہ چلتا تھا کہ کوئی بھی فرار نہیں ہوا، سبھی آزادی کے لیے شہید ہو گئے۔'' اگر چہ لکھنؤ شہر آزادی کے دیوانوں کے خون سے سرخ ہو گیا تھا لیکن آزادی کے متوالوں کے حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ زبردست مقابلے کے بعد موتی محل انگریزی فوج کے قبضے میں آ سکا۔'' 23 نومبر کو کیمپبیل کی فوج ریزیڈنسی تک پہنچ گئی اور جملہ قیدیوں کو آزاد کرانے کے بعد دلکشا کو اپنا قلعہ بنایا۔

نواب واجد علی شاہ کی ڈائری کے مطابق بیگم حضرت محل کی پیدائش فیض آباد کے ایک غریب خاندان میں ہوئی تھی۔ غیر معمولی خوبصورتی کی ملکہ اس دوشیزہ کو ''خواصین'' کی صورت میں نواب کے ''حرم'' میں بیگموں کی خدمات کے لیے رکھا گیا۔ لیکن بہت جلد انھوں نے اپنی ذہانت، خوبصورتی اور دیگر کاموں میں اپنی مہارت کے باعث نواب کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی اور وہ حرم میں شامل کر لی گئیں۔ نواب نے انھیں ''مہک پری'' کا خطاب دیا۔ بعد ازاں جب انھوں نے بیٹے کو جنم دیا تو نواب نے انھیں ''محل'' کا درجہ اور ''افتخار النساء'' کے خطاب سے نوازا۔ اس طرح ایک باندی سے انھوں نے بادشاہ کے حرم میں اعلیٰ مقام حاصل کیا اور بیگم حضرت محل کے نام سے مشہور ہوئیں۔ تاج پوشی کے بعد بیگم حضرت محل نے برجیس قدر کے نام ایک اعلان نامہ جاری کیا کہ'' جہاں کہیں فرنگی ملیں، انھیں موت کے گھاٹ اتار دو۔'' اس وقت بیگم کی عمر محض 26 سے 27 سال کی تھی۔ پھر بھی انھوں نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ایسی فوج کھڑی کر دی تھی کہ ان کی قیادت میں فوج اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ملک کو آزاد کرانے کے لیے بے قرار ہو اٹھی۔ عالم باغ میں 22 دسمبر 1857 کو ان کی فوج نے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیے۔ مگر سب تدبیریں الٹی

رہیں۔ بالآخر مجبوراً وہ لکھنؤ چھوڑ کر شاہ جہاں پور چلی گئیں۔ بعد میں بیگم حضرت محل اپنے حامیوں کے ساتھ گھاگھرا ندی کو پار کر کے بہرائچ ضلع کے بونڈی قلعے میں چلی گئیں۔ یہاں انھوں نے اس قلعے کو مضبوط کرایا اور جنگ جاری رکھی۔ لیکن قسمت نے ساتھ نہیں دیا اور وہ بونڈی قلعے کو بچانے میں ناکام رہیں۔ دسمبر 1858 میں بیگم حضرت محل کو مجبوراً اس قلعے کو بھی چھوڑنا پڑا اور بیگم حضرت محل دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے نیپال کی جانب چلی گئیں۔ نیپال میں قیام کے دوران بھی انھوں نے جدوجہد آزادی کے سپاہیوں سے مستقل رابطہ قائم رکھا۔ نیپال میں اپنے لائق اعتماد ساتھی رانا بنی مادھو سنگھ، مفتاح الدولہ اور اپنے بیٹے برجیس قدر کے ساتھ اپنی بقیہ زندگی گزارتے ہوئے اپریل 1879 میں وہ موت کی آغوش میں چلی گئیں۔ آخر میں بیگم حضرت محل کی نظم ملاحظہ کریں:

ساتھ دنیا نے دیا اور نہ
مقدر نے دیا
رہنے جنگل نے کب دیا جو
شہر نے نہ دیا
اک تمنا تھی کہ آزاد
وطن ہو جائے
جس نے جینے نہ دیا چین سے
مرنے نہ دیا
زمیں کی آگ بجھانے سے گھٹا
امڑی تھی
ہاں، مگر الٹی ہواؤں نے
ٹھہرنے نہ دیا
بکھر چلا وہ قافلہ
مقام بوڑی سے
چال دشمن کی کچھ ایسی،
ابھرنے نہ دیا
ظلم کی آندھیاں بڑھتی رہیں
لمحہ لمحہ
پھر بھی پرچم کو آسماں سے
اترنے نہ دیا

(بشکریہ ''ہندوستان'' مورخہ 18 ستمبر 2006)

□□□

تلخیص و ترجمہ — محمد عمر رضا

224-E, Mahanadi Hostel
Jawaharlal Nehru University
New Delhi-110067

انیس کے مرثیے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام دستیاب مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جو اب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اوّل، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 540، قیمت: -/36 روپے
جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 575، قیمت: -/40 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر

سید امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یوروپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ میں جو باہمی قربت و موانست ہے، اس کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نمائندہ شاعروں کا تفصیلی بیان ہے جو تجزیاتی انداز کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا بسیط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 740، قیمت: -/145 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 066 110

اقبال محی الدین

شمسی توانائی

انسانی زندگی کی نقل و حرکت کا خاصا انحصار توانائی پر ہے۔ آج جس بڑے پیمانے پر توانائی کا استعمال ہو رہا ہے اس سے خدشہ یہ ہے کہ توانائی کے ذخائر بہت دنوں تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔ توانائی کے یہ ذخائر اور ذرائع ماحول کو بھی آلودہ کر رہے ہیں۔ ہمیں توانائی کے نئے متبادل تلاش کرنے ہوں گے تاکہ توانائی کے ساتھ ساتھ ماحول کو بھی آلودگی سے بچایا جاسکے اور یہ تبھی ممکن ہے جب ہم تیل، کوئلہ، لکڑی اور گوبر کے علاوہ دھوپ، ہوا، پانی اور دیگر توانائی کے قدرتی ذرائع کا استعمال کریں۔ مزید برآں شمسی توانائی جو کبھی نہ ختم ہونے والا ذریعہ ہے۔ روایتی توانائی کے ذرائع ہیں کوئلہ، معدنی تیل، لکڑی اور گوبر وغیرہ جب کہ غیر روایتی توانائی حاصل کرنے کے ذرائع ہیں شمسی توانائی، آبی یا موجی توانائی، ہوائی توانائی، پودوں سے پٹرول کشید کرکے توانائی حاصل کرنا، جوہری توانائی، بائیو گیس اور ارضی حرارتی توانائی۔

کوئلہ، معدنی تیل اور برقاب— توانائی حاصل کرنے کے تین اہم وسائل ہیں جن میں جوہری توانائی کا اضافہ ابھی حال میں ہوا ہے۔ کوئلہ توانائی کے حصول یا صنعتی ایندھن کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ کوئلے کی تین قسمیں ہیں۔ اینتھرا سائیٹ، بیٹومینس، اور لگنائیٹ۔ ان سب میں سب سے عمدہ قسم انتھرا سائیٹ کی ہوتی ہے جس میں دھواں کم نکلتا ہے اور بہت گرمی دیتا ہے۔ دوسری قسم میں دھواں نسبتاً زیادہ نکلتا ہے مگر یہ بھی کافی گرمی دیتا ہے۔ تیسری قسم میں آنچ کم اور دھواں بہت ہوتا ہے۔ بجلی پیدا کرنے کے لیے ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کوئلہ ریاست بہار، مغربی بنگال، اڑیسہ، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش اور تمل ناڈو میں دستیاب ہوتا ہے۔ ہندوستان کے کل کوئلے کے ذخیروں کا 80 فیصدی حصہ بہار تا مغربی بنگال کی کوئلے کی پٹی میں ہے اور یہ پٹی وادیٔ دامودر میں واقع ہے۔ اس پٹی کے اہم کوئلہ والے علاقے رانی گنج، ڈالٹن گنج، جھریا، گری ڈیہہ، بوکارو اور کرن پورا ہیں۔ کوئلہ کے دیگر خطے گوداوری، وردھا، سون، مہاندی اور ست پڑا، چھتیس گڑھ اور دیوگڑھ میں ہیں۔

ہندوستان میں تقریباً 31 فیصدی کوئلے کی کھپت صرف ہندوستانی ریلیں کرتی ہیں۔ تقریباً 19 فیصدی کوئلے کی فولاد کی صنعت کو ضرورت ہوتی ہے۔ 11 فیصد کوئلے کی کھپت حرارتی بجلی تیار کرنے والے بجلی گھروں کو ہوتی ہے اور 12 فیصد کوئلے کا استعمال سیمنٹ کے کارخانوں، کپاس و پٹ سن کی ملوں، انجینئری کا سامان بنانے والی فیکٹریوں اور کیمیائی صنعت میں ہوتا ہے۔

کوئلے کے علاوہ قدرتی تیل یا پٹرولیم توانائی حاصل کرنے کا دوسرا ذریعہ ہے۔ اور یہ نہایت کارآمد ایندھن بھی ہے۔ کچے قدرتی تیل سے ہمیں مٹی کا تیل، ڈیزل، پٹرول، اسپرٹ، کھانا پکانے کی گیس وغیرہ حاصل ہوتی ہے۔ ہماری روزانہ کی زندگی میں قدرتی تیل اور اس سے بنی ہوئی اشیا کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اسکوٹر، موٹر سائیکل، کار، بسیں، ریل گاڑیاں، جہاز، ہوائی جہاز، ملیں اور فیکٹریاں وغیرہ پٹرول اور ڈیزل سے چلتے ہیں۔ غرض یہ کہ قدرتی تیل یا پٹرولیم ہماری معاشی زندگی کی شہہ رگ ہے۔

آسام اور گجرات میں تیل کے چشمے ہیں جو توانائی کے بہترین وسائل ہیں۔ ان چشموں سے تیل نکالا جاتا ہے اور وہ خام تیل کارخانوں میں صاف کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ ممبئی، چنئی، وشاکھاپٹنم، کوچین، بڑودا، متھرا، برونی، ہلدیہ اور گوہاٹی میں ایسے بہت بڑے بڑے تیل صاف کرنے کے کارخانے ہیں۔ قدرتی گیس بھی زمین کے نیچے پائی جاتی ہے۔ اس کا استعمال کھانا پکانے میں کیا جاتا ہے۔ آج کل اس کا استعمال فیکٹریوں کو چلانے میں کیا جارہا ہے۔ ہمارے تیل کے دریافت ذخیرے اور ان سے خام تیل کی پیداوار دنیا کے تیل کے ذخیروں اور پیداوار کے مقابلے میں بہت کم ہیں اور ہماری ضرورت بہت زیادہ ہے۔ اس لیے ہندوستان کو اپنی ضرورت کا دو تہائی تیل برآمد کرنا پڑتا ہے۔

ہندوستان میں چند خاص قسم کے معدنی ذخائر ہیں جن سے ایٹمی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ ایٹمی توانائی کی موجودہ دور میں بڑی اہمیت ہے۔ یورینیم، تھوریم، ملنائیٹ، موناز ائیٹ، زرکان، سلی منائیٹ اور بیریلیم سے ایٹمی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ یورینیم بہار میں ملتا ہے۔ کیرالا کے ساحل پر غیر معمولی ریت کے جماؤ کا بڑا علاقہ ہے جس سے تھوریم نکالا جاتا ہے۔ اس ریت میں تقریباً بارہ کروڑ ٹن لمنائیٹ اور بڑی تعداد میں موناز ائیٹ، زرکان اور سلی منائیٹ ہے۔ بیریلیم راجستھان میں ملتا ہے۔

ہندوستان میں کئی ایٹمی توانائی اسٹیشن کام کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے پرانا اسٹیشن مہاراشٹر اور گجرات کی سرحد پر واقع تارا پور میں ہے۔ یہ 1969 میں قائم کیا گیا تھا جس سے 4,20,000 کلوواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے۔

دوسرے دو ایٹمی توانائی اسٹیشن راجستھان میں کوٹا کے قریب رانا پرتاپ ساگر باندھ پر اور دوسرا تمل ناڈو میں چنئی کے قریب کلپاکم میں ہے۔ ہندوستان کا چوتھا ایٹمی توانائی اسٹیشن مغربی اتر پردیش میں بلند شہر کے قریب نرورا میں ہے۔ ان مراکز سے حاصل بجلی کا استعمال زراعتی ترقی کے لیے ہوتا ہے۔ توانائی کے دوسرے متبادل ذرائع میں آبی یا موجی توانائی، ہوائی توانائی، بائیو گیس، ارضی حرارتی توانائی، کوئلہ سے پٹرول کی توانائی، کوڑا کرکٹ کی توانائی، پودوں سے پٹرول تیار کرکے توانائی حاصل کرنا اور شمسی توانائی وغیرہ۔ موجی توانائی یعنی سمندر یا دریا کی لہروں سے توانائی حاصل کرنا۔ اس طریقے سے توانائی حاصل کرنے کی تاریخ تقریباً ایک صدی پرانی ہے۔ 1881 میں فرانس کے سائنس داں J.D. Arsalowal نے سب سے پہلے اس ذیل میں کوشش کی تھی۔ اس کو تھوڑی کامیابی ملی۔ مگر کلائیڈ نامی سائنس داں نے 1929 میں پوری کامیابی حاصل کی۔ 1977 میں فرانس کے سینٹ مالو کے مقام پر دریائے فرانس کے دہانے پر 70 کلومیٹر لمبا دہانہ بنایا گیا اور اس پر 24 Generators نصب کیے گئے۔ جس سے آج 240 میگاواٹ بجلی حاصل ہو رہی ہے۔ بعض سائنس دانوں کے مطابق بحرالکاہل میں ایک عام لہر کی ایک میٹر لمبائی میں تقریباً 50 کلوواٹ توانائی کی طاقت ہے۔ جن ممالک کے سمندری ساحلی علاقے لمبے ہوں گے وہ اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔ چونکہ ہندوستان کے پاس 4,800 کلومیٹر لمبا سمندری ساحل ہے لہٰذا اسے موجی توانائی میں خود کفالت کے مزید مواقع حاصل ہو سکیں گے۔ ہوائی چکیوں سے بھی توانائی یعنی بجلی حاصل کی جا رہی ہے۔ یہ ہوائی چکیاں کس قدر موثر اور وسیع ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بڑے سائز کی چار لاکھ ہوائی چکیوں سے جس قدر بجلی حاصل ہوگی وہ پورے یوروپ کو اس وقت درکار بجلی سے بھی تین گنا زیادہ ہوگی۔ ساحلی علاقوں میں یہ چکیاں نصب کی جاتی ہیں جن میں ایک طرف سے تیز ہوا کی لہر داخل ہوتی ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتی ہے۔ اس عمل سے ان چکیوں کے اندر کا پہیہ حرکت میں آ جاتا ہے اور یوں بجلی پیدا ہونے لگتی ہے۔ بائیو گیس کی تکنالوجی اب ہندوستان میں بھی متعارف ہو چکی ہے۔ اس میں انسانی اور حیوانی فضلے، کوڑے کرکٹ اور کھاد وغیرہ کو ملا دیا جاتا ہے جن کے ردعمل سے میتھین (Methene) گیس پیدا ہوتی ہے پھر اس کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ خصوصاً تیسری دنیا کے کم ترقی یافتہ ممالک جن میں ذرائع توانائی کم ہیں وہاں یہ تکنالوجی ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ بائیو گیس کا استعمال کھانا پکانے میں ہوتا ہے اور اس سے بجلی بھی پیدا کی جا رہی ہے۔ امریکہ اور چین میں اس تکنالوجی سے بجلی کثیر مقدار میں پیدا کی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی اس تکنالوجی سے بجلی بنانے کا کام شروع ہو چکا ہے۔

زمین کی گہرائیوں میں حرارت کا بے شمار خزانہ دفن ہے۔ ماہرین ارضیات کے مطابق زمین کی اس پپڑی کے نیچے درجۂ حرارت 7200°F یعنی 4000 سینٹی گریڈ ہے۔ حرارت اکثر آتش فشانوں کے علاوہ زمین کے مختلف حصوں سے خارج ہونے والی بھاپ کی شکل میں بھی ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ 1904 میں Geo-Thermal Energy کو کام میں لانے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ زمین کے اندر کی بھاپ کو پائپ کے ذریعے چرخاب تک لایا گیا اور اس سے بجلی پیدا کی گئی۔ زمین اندر سے بہت گرم ہے اور اس میں جگہ جگہ پر گرم پانی کی دھار یا سوکھی بھاپ کی تیز دھار پھوٹتی رہتی ہے۔ اس حرارت کو اگر توانائی میں بدل دیا جائے تو ہزاروں سال تک توانائی کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ کوئلہ سے پٹرول بنانے کا طریقہ جنوبی افریقہ میں شروع ہوا۔ وہاں کوئلے کی کانیں وافر مقدار میں کوئلہ فراہم کر سکتی ہیں مگر یہ طریقہ بہت مہنگا ہے اور اس میں کوئلے کی کھپت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کوڑا کرکٹ سے بھی توانائی پیدا کی جا سکتی ہے۔ ماہرین کے مطابق امریکہ میں سالانہ 25 کروڑ ٹن کوڑا پھینکا جاتا ہے۔ اس سے دس کروڑ ٹن کوئلے کے برابر توانائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ پودوں سے بھی پٹرول حاصل کیا جاتا ہے۔ ماہرین کی تحقیق کے مطابق گنے کے رس سے الکوہل (Alcohal) بنائی جاتی ہے اور اس الکوہل کو بطور پٹرول استعمال کرکے گاڑی چلائی جا سکتی ہے۔ دنیا بھر میں پودوں سے الکوہل کا سب سے زیادہ ایندھن پیدا کرنے والا ملک برازیل ہے کیونکہ وہاں گنا بہت پیدا ہوتا ہے۔ اس تکنیک کا ہمارے ملک میں بھی استعمال ہو رہا ہے۔

عہد حاضر کے سائنس داں سورج کی روشنی سے توانائی حاصل کرنے کے تجربات میں مصروف ہیں اور کافی حد تک انھیں کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ ہوا کی طاقت کا استعمال دنیا کے کچھ ممالک نے آٹے کی چکیوں کو چلا کر کیا ہے۔ بہتے ہوئے پانی کو باندھ کے ذریعے روک کر بہت اونچائی سے گرا کر بجلی پیدا کرتے ہیں۔ اگر سائنسی ترقی اسی رفتار سے ہوتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب سورج کی روشنی سے طاقت حاصل کرکے ہر وہ کام کیا جائے گا جو آج قدرتی تیل سے ہو رہا ہے اور جس کے ذخائر محدود ہیں۔ شمسی توانائی کبھی نہ ختم ہونے والی توانائی ہے۔ سورج کی دھوپ اپنے آپ میں آلودگی سے پاک ہے اور بہ آسانی میسر ہے۔ ہندوستان کو یہ سہولت حاصل ہے کہ سال کے 365 دنوں میں 250 سے لے کر 320 دنوں تک سورج کی پوری دھوپ ملتی رہتی ہے۔ دن میں سورج چاہے دس سے بارہ گھنٹے تک ہی ہمارے ساتھ رہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سورج کی گرمی ہمیں رات دن کے 24 گھنٹے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس میں نہ دھواں ہے، نہ کثافت اور نہ ہی آلودگی۔ دیگر ذرائع سے حاصل توانائی کے مقابلے میں سورج کی روشنی سے 36 گنا زیادہ توانائی حاصل ہو سکتی

ہے۔ جب کہ صورت حال یہ ہے کہ سورج کی روشنی کرنوں کی شکل میں صرف چوتھائی حصہ ہی زمین پر آتی ہے اور تین چوتھائی حصہ کرۂ باد میں ہی رہ جاتی ہے۔ سورج اپنی توانائی X-Ray سے لے کر Radio-Wave کے ہر Wave-Length پر منعکس کرتا ہے۔ اسپکٹرم (Spectrum) کے 40 فیصد حصے پر یہ توانائی نظر آتی ہے اور 50 فیصد شمسی توانائی انفرا ریڈ (Infra-Red) اور بقیہ Ultra-Violet کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ دھوپ سے حاصل ہونے والی توانائی ''سولر انرجی'' یا ''شمسی توانائی'' کہلاتی ہے۔ دھوپ کی گرمی کو پانی سے بھاپ تیار کرکے جنریٹر چلانے اور بجلی بنانے میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دھوپ قدرت کا عطیہ ہے، ہر روز دنیا پر اتنی دھوپ پڑتی ہے کہ اس سے کئی ہفتوں کے لیے بجلی تیار کی جا سکتی ہے۔

سورج زمین سے تقریباً 15 کروڑ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ چونکہ آفتاب میں صرف تپتی ہوئی گیس پائی جاتی ہے، اس لیے اس کی کثافت (Density) کم ہے۔ اس کا وزن زمین سے سوا تین لاکھ گنا زیادہ ہے۔ سورج کی باہری سطح کا درجۂ حرارت تقریباً 6 ہزار ڈگری سیلسیس ہے۔ اس کے مرکزی حصے کا درجۂ حرارت ایک کروڑ ڈگری Celcius ہے۔ اس کے چاروں طرف روشنی اور حرارت نکلتی رہتی ہے۔ سورج کی سطح کے فی مربع سینٹی میٹر سے پچاس ہزار موم بتیوں جتنی روشنی نکلتی ہے اور زمین سورج سے نکلی ہوئی طاقت کا محض دو سو بیس کروڑواں حصہ ہی اخذ کر پاتی ہے۔ شمسی توانائی کے بغیر زمین پر زندگی ممکن نہیں۔ سبز پتیوں والے پودے اس طاقت کا استعمال کرتے ہیں جس کے باعث ان میں Photosynthesis کا عمل ہوتا ہے۔

آج شمسی توانائی سے بہت سے کام لیے جا رہے ہیں۔ چاہے کھانا پکانا ہو، پانی گرم کرنا ہو یا مکانوں کو ٹھنڈا یا گرم رکھنا ہو۔ فصلوں کے دنوں میں دھان سکھانا ہو یا پائپوں کے ذریعے سینچائی۔ دہلی کے نزدیک گوالی پہاڑی میں سورج سے بجلی کی توانائی حاصل کرنے کے لیے ایک بجلی گھر بنایا گیا ہے جہاں پیداوار اور تحقیق کام کیے جا رہے ہیں۔ ملک کے دیگر حصوں میں Solar Photovoltaic Centres قائم کیے جا چکے ہیں جو ایک کلوواٹ سے ڈھائی کلوواٹ تک بجلی پیدا کرتے ہیں۔ گھروں، ڈیریوں، کارخانوں، ہوٹلوں اور اسپتالوں میں پانی گرم کرنے کے لیے ایسے آلات لگے ہیں جو 100 لیٹر سے لے کر سوا لاکھ لیٹر تک پانی گرم کر سکتے ہیں۔ شمسی چولھے کم سے کم دو کلو لکڑی کی بچت کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں اگر 17 کروڑ خاندان مان لیے جائیں تو روزانہ کم از کم 34 کروڑ کلو لکڑی کی بچت کی جا سکتی ہے۔ ان اقدامات کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا ملک غیر روایتی توانائی کے میدان میں داخل ہو چکا ہے اور توانائی حاصل کرنے کا مستقبل اب دھوپ، سمندر کے پانی اور ایک قسم کی ایٹمی توانائی جو کہ Nuclear Fusion کہلاتی ہے، جیسے ذرائع سے وابستہ ہوتا جا رہا ہے۔

□□□

پتہ:
46, Nishat Apartment
Near Shamshad Market
A.M.U. Aligarh (U.P.)

کوشش (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایک ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کی شکل اختیار کر لے۔ فلم ''کوشش'' کا یہ منظر نامہ جاپانی فلم ''ہیپی نیس آف اس الون'' پر مبنی ہے جس میں ایک گونگے بہرے لڑکے اور ایک گونگی بہری لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 84، قیمت -/48 روپے

میرے اپنے (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

قومی اردو کونسل نے فلمی منظر ناموں کی اشاعت خاص طور سے ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی کے لیے شروع کی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا کیریئر بنانے کے خواہش مند ہیں۔ منظر نامہ ''میرے اپنے'' مشہور فلم ساز تپن سنہا کی بنگالی فلم ''اپن جن'' کی کہانی پر مبنی ہے۔

صفحات: 139، قیمت: -/63 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی - 066 110

کاشف غزالی

ایکسرے اور ریڈیم کی دریافت

ایک روز جرمن یونیورسٹی کا ایک پروفیسر ولہیم رونٹجن، خلائی نلکیوں سے تجربہ کر رہا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، کہ ان خلائی نلکیوں کی لطیف بنائی ہوئی گیسوں میں سے جب برقی رو گزاری جاتی ہے تو پھر کیا ہوتا ہے۔ اس نے خلائی نلکی کو کالے گتے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ تاکہ برقی رو سے نکلنے والی روشنی کو روکا جا سکے۔ پاس ہی ایک بینچ پر کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا تھا جس پر کیمیاوی رنگ چڑھایا گیا تھا تاکہ جب الٹراوائلٹ شعاعیں اس سے ٹکرائیں تو ان کے عمل سے روشنی کی مخصوص خاصیت نمودار ہو سکے۔ روشنی کی یہ مخصوص خاصیت اندھیرے میں چمکنے والی شے سے مختلف ہے۔ چونکہ بعد کی یہ خاصیت جب عام روشنی کے سامنے آتی ہے تو کچھ دیر کے لیے خود بخود چمکنے لگتی ہے لیکن شفاف سطح اس وقت تک چمکے گی جب تک شعاعیں اس سے ٹکراتی رہیں گی۔

جب رونٹجن نے ڈھکی ہوئی ٹیوب میں برقی شعلہ پیدا کیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ رنگ چڑھا کاغذ شفاف ہو گیا ہے۔ وہ کاغذ وہاں پڑا ہوا چمک رہا تھا جب کہ کوئی بھی خفیہ روشنی ڈھکی ہوئی نلکی میں سے نہیں نکل سکتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ کچھ ایسی شعاعیں جو نظر نہیں آتی تھیں اُس نلکی سے نکل رہی تھیں اور اس کاغذ کو اس طرح چمکنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ جب رونٹجن نے نلکی کے گتے کے ڈھکن کے سوا باقی دوسری اشیا کی آزمائش کی مثلاً لکڑی، کاغذ اور کپڑے کی چھان بین کی تو اسے پتہ چلا کہ یہ چیزیں کوئی مزاحمت نہیں پیش کرتی تھیں۔ یہ چیزیں بھی اُن دیکھی شعاعوں کے سامنے شفاف ہو گئی تھیں۔ اُس نے فوٹوگرافی کی پلیٹوں کی آزمائش کی تو اُس نے دیکھا کہ وہ دھندلی ہو گئی ہیں، جیسے اُن پر بجلی گر پڑی ہو۔ البتہ دھاتوں نے مزاحمت پیش کی۔ ان شعاعوں کو اشیا کی طرف سے پیش کی جانے والی مزاحمت کے فرق نے (خاص طور پر گوشت اور ہڈیوں کے درمیان) اس بات کو ممکن بنایا کہ ایک زندہ جسم کے اندر کے ڈھانچے کو دیکھا جا سکے۔

ماہ نومبر 1895 میں رونٹجن نے ان نئی اور پُر اسرار شعاعوں کے متعلق جو دریافت کی تھیں اس کے مطابق اس نے ان شعاعوں کو ''ایکسرے'' کا نام دیا۔ چونکہ علم ریاضی میں ایکس ایک نامعلوم مقدار کی علامت ہے۔ بہر کیف ان شعاعوں کے دریافت کنندہ کے نام پر انھیں رسمی طور سے رونٹجن شعاعوں کا نام دیا گیا اور وہ یورپ میں عام طور سے ابھی تک انھی شعاعوں کے نام سے مشہور ہیں۔ امریکہ میں ہم ان شعاعوں کو ایکسرے کہتے ہیں۔ یہ نام رونٹجن نے ہی انھیں دیا تھا۔ جن اشیا میں سے روشنی نہیں گزر سکتی ان سے یہ شعاعیں کیوں کر آسانی سے گزر سکتی ہیں۔ اس لیے ایکسرے صنعتی اور معالجاتی میدانوں میں بیش بہا ثابت ہوئی۔ بالخصوص موخر الذکر میدان میں جہاں بنی نوع انسان کی خاطر ان کی خدمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

سائنسداں فوراً ان اَن دیکھی شعاعوں کی تحقیق میں جٹ گئے لیکن 1912 تک کوئی یقین سے یہ نہ کہہ سکا، کہ یہ شعاعیں کیا ہیں۔ ایک فرانسیسی ماہر طبیعات نے جس کا نام بیکوریل تھا یہ بات دیکھی کہ ایک ایکسرے نلکی سے جب شعاعیں نکلتی ہیں، تو سبزی مائل روشنی سے چمکنے لگتی ہیں۔ وہ اس بات پر حیران ہو رہا تھا کہ کیا وہ چیزیں جو شفاف بن جاتی ہیں، وہ بھی ریڈیائی لہریں چھوڑتی ہیں کہ نہیں؟ اس نے ایک سیاہ رنگ کے کاغذ میں بہت سی شفاف چیزیں لپیٹ دیں اور انھیں فوٹوگرافی کی ایک فلم کے نیچے رکھ دیا۔ ان میں ایک چیز یورنیم کا کھار تھی۔ اس چیز کے سوا کسی چیز پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس میں سے ایک ایسی شعاع نکلی جس نے فلم کو دھندلا کر دیا۔

اس کے بعد اس نے یہ بات دریافت کی کہ یورنیم ایسا ہی کرے گا چاہے اسے شفاف بنایا جائے یا نہ بنایا جائے۔ اس نے اعلان کیا— ''یہ مادہ کی ایک نئی خصوصیت ریڈیائی گرم تابی ہے۔'' اس نے پہلے پہل یہ لفظ گھڑا۔

ایک طویل اور تھکا دینے والے سائنسی مسئلہ کے سلسلہ میں پروفیسر اور مادام کیوری میاں بیوی پہلی ایک روشن مثال ہیں جنھوں نے مل کر یہ کام کیا۔ مادام کیوری مشہور سائنسداں پولینڈ کی رہنے والی ایک دبلی پتلی عورت تھیں۔ عمر بھر وہ مفلس اور نادار رہیں، اور حاسدین ان سے حسد کرتے رہے۔ تاہم اپنے کردار، اپنی ذہانت اور اپنی قوت ارادی سے انھوں نے کامیابی اور شہرت حاصل کی۔ وہ اس صدی کے صفِ اوّل کے سائنس دانوں میں شمار کی گئیں۔

میری سکلو دروا سکا پولینڈ کی راجدھانی وارسا میں پیدا ہوئیں۔ اس ملک پر اس وقت زار کی حکمرانی تھی مشہور نغمہ نگار شوپن کی طرح ساری زندگی ان کے دل میں حب الوطنی کی شمع روشن رہی۔ ان کے والد یونیورسٹی میں علم طبیعات کے پروفیسر تھے۔ میری، جس کا نام اس وقت مانیا تھا اچھی تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ بالخصوص جدید زبانوں کی تعلیم۔ یہ اس کا تنہا ورثہ تھا اور

اس سے اس نے سترہ برس کی عمر میں ایک اُستانی کے پیشہ سے آغاز کیا۔ وہ اپنی آدھی تنخواہ، اپنی بہن کو بھجوا دیتی تھی، جو اس وقت پیرس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

میری نے سائنس میں ماسٹر ڈگری کے لیے سوربون میں اپنا نام رجسٹرڈ کروایا۔ جلد ہی اس نے اپنے پول نام مانیا کی جگہ اپنا نام میری رکھ لیا۔ چونکہ جس سے بھی اس کی فرانس میں ملاقات ہوئی۔ اسے اس کے پول نام کے ہجے کرنے میں دقّت پیش آئی۔ لیکن اس نے اپنے نام کا آخری جز سکلو دووسکا نہ بدلا۔ وہ چاہے بگاڑ کر ہی اس کے ہجے کرتے رہے۔ لاطینی شعبے میں اسے پولینڈ کے چند اور طالب علم بھی ملے۔ یہاں نوجوانوں کو اجازت تھی کہ وہ آزاد پولینڈ کے متعلق جتنی بلند آواز سے چاہیں، نعرے لگا سکتے ہیں، اور انھیں سائبیریا بھیجے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یونیورسٹی کے ایّام میں میری کی زندگی کا یہ ایک درخشاں باب تھا۔

سال کے ختم ہونے پر اس کے لیے اپنی بہن کا گھر چھوڑنا اور اپنا ایک گھر بنانا ضروری ہوگیا۔ اس کے پاس اخراجات کے لیے صرف تین فرانک روزانہ کے حساب سے روپیہ تھا۔ ان دنوں امریکی روپے میں یہ تقریباً 60 سینٹ بنتے تھے۔ اس نے ایک چھوٹا ساعقبی کمرہ کرایے پر لے لیا۔ اس کمرے میں صرف ایک کھڑکی کے ذریعے سورج کی روشنی آ سکتی تھی۔ اس کمرے میں حرارت پہنچانے کا، روشنی اور پانی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ وہ الکوحل کی انگیٹھی پر اپنا کھانا پکاتی تھی۔ اپنی دوسری انگیٹھی کو جلانے کے لیے اسے یہ انگیٹھی سیڑھیوں کے اوپر لے جانی پڑتی تھی۔ بعض اوقات اسے پانی کی بالٹی بھی سیڑھیاں چڑھ کر لانی پڑتی تھی۔ لیکن وہ سردیوں میں کئی راتیں اور دن ٹھنڈ ہی میں بسر کرتی تھی تا کہ ایندھن بچا سکے اور بہت سے دن ایسے بھی آتے تھے جب وہ روٹی اور چائے کے سوا اور کچھ نہیں کھاتی پیتی تھی۔

اس نے سوربون میں جب امتحان پاس کرلیا، تو وارسا میں اس کے ایک دوست نے ایسا انتظام کیا کہ اسے الگزینڈر رووچ وظیفہ مل جائے، جو صرف ان ذہین طلبہ کو ملتا تھا، جو غیر ممالک میں جا کر پڑھنا چاہتے تھے۔ یہ وظیفہ چھ سو روبل سالانہ کا تھا۔ اس سے سال بھر بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔ ان دنوں ایک روبل صرف 50 سینٹ کا تھا لیکن اس نے اتنے میں ہی گزارا کیا۔ بعد کے برسوں میں اس نے اپنی بچت کی رقم میں سے ایک ایک روبل لوٹا دیا، تا کہ اور کوئی طالب علم اس روپے کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے حاصل کر سکے۔

1895 میں میری نے سائنس کے ایک نوجوان پروفیسر پیری کیوری سے شادی کر لی۔ یہ شخص فرانس کے بجائے غیر ممالک میں زیادہ مشہور تھا۔ اس کے بعد تحقیق وتفتیش کے کام میں ساتھیوں کی حیثیت سے میاں بیوی کی مسرّت بخش شراکت کا دور شروع ہوا۔ ان کے یہاں دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ بڑی لڑکی ایرین کی قسمت میں خود نوبل انعام حاصل کرنا لکھا تھا لیکن ماں ہونے کا مطلب یہ تھا کہ میری گھر کا کام بھی کرے، اور بچوں کی دیکھ بھال بھی کرے۔ اس کے باوجود اس نے سائنس سے متعلق اپنا کام ترک نہ کیا۔ اس کا خاوند اس کے قریب تھا اور وہ رونٹجن اور بیکوریل کی دریافتوں سے بالخصوص موخرالذکر کے ''ریڈیائی گرم تابی'' کے متعلق نظریے سے بہت مسحور ہوئی تھی— اس ریڈیائی گرم تابی کی خصوصیت کیا تھی؟ یہ دریافت کا ایک ولولہ انگیز میدان دکھائی دیتا تھا۔

میری نے اس مسئلہ پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اسے جلد ہی اس بات کا پتہ چل گیا کہ بعض دھاتوں اور کچھ دھاتوں کی ریڈیائی گرم تابی ان مرکبات میں پائی جانے والی یورنیم یا تھیوریم دھاتوں کی مقدار سے کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ یورنیم اور تھیوریم دو ایسے عناصر تھے جن میں رونٹجن اور بیکوریل نے ریڈیائی گرم تابی دیکھی تھی۔ یہ ایک غلطی نظر آتی تھی۔ اس نے دس اور بیس مرتبہ تجربہ کیا، مگر نتائج وہی نکلتے تھے۔ اسے پتہ چلا کہ پچ بلینڈ— جو یورنیم کی مصنوعات ہے، خالص یورنیم سے پانچ گنا زیادہ ریڈیائی گرم تاب ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کچی دھات میں کوئی اور ریڈیائی گرم تاب چیز بھی تھی۔ مزید تجربے کرنے پر اس نے دو جوہر دریافت کیے، جو یورنیم سے زیادہ ریڈیائی گرم تاب تھے۔

جولائی 1898 میں کیوری کنبہ نے یورنیم سے چار سو گنا زیادہ ایک ریڈیائی گرم تاب کیمیاوی عنصر کی موجودگی کا اعلان کیا۔ اپنے وطن کے نام پر اس کو میری نے پولونیم کا نام دیا۔ بار بار بہت سے تجربے کرنے کے بعد کیوری کنبہ ایک ایسے شفاف جوہر کو تشکیل دینے میں کامیاب ہوگیا، جو یورنیم سے نو سو گنا زیادہ ریڈیائی گرم تاب تھا۔ ایسا کوئی اور عنصر بھی ہوگا۔ لہٰذا اسی سال ماہ دسمبر میں کیوری کنبہ نے ایک اور اعلان کیا کہ انھوں نے ایک ریڈیائی گرم تاب کیمیاوی جوہر دریافت کیا ہے۔ اس کو انھوں نے ریڈیم کا نام دیا۔ یہ لاطینی زبان کے لفظ ریڈیر سے لیا گیا تھا جس کا مطلب ہے شعاعیں برسانے والا— چار سال کے بعد میری صرف ایک گرام ریڈیم کلورائڈ کو الگ کرنے میں کامیاب ہو سکی۔ لیکن وہ آٹھ سال کے بعد ہی آخرکار خالص ریڈیم الگ کرنے میں کامیاب ہوئی۔ یہ ایک ایسا عنصر ہے۔ جسے سائنس کے مصنفین یورنیم سے لگ بھگ دس لاکھ اور چالیس لاکھ گنا سے زیادہ ریڈیائی گرم تاب بیان کرتے ہیں۔

یہ تمام دریافتیں برسوں کی بے کیف اور کڑی محنت کا نتیجہ ہیں۔ پیرس کے علم طبیعیات سے متعلق اسکول کے ڈائرکٹر نے کیوری کنبہ کو اسکول کے

احاطہ میں شیشوں والے گودام کو تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کمرے کا کوئی فرش نہیں تھا۔ کوئی سہولت اور ساز و سامان بھی نہیں تھا۔ اپنے بیش بہا ریڈیم کے ٹکڑوں کے حصول کے علاوہ میری کو بھاری مقدار میں کچی دھات سے نپٹنا اور اسے صاف کرنا پڑتا تھا، جو بوریوں میں بھر کر لائی جاتی تھی۔ پیری بھی اپنی بیوی کے کام میں جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو کڑی محنت کرتا تھا لیکن ایک روز جب وہ پیرس کے ایک بازار میں سڑک کو پار کر رہے تھے، تو ٹیکسی کی زد میں آ کر ہلاک ہو گئے۔ یہ واقعہ اپریل 1906 کا ہے۔ اور وہ اس کام کو مکمل ہوتا ہوا بھی نہ دیکھ سکے۔

مادام کیوری کو 1911 میں علم کیمیا کا نوبل انعام دیا گیا۔ یہ انعام اس نے اپنے نام پر نہیں، بلکہ اپنے خاوند کے نام پر قبول کیا۔ اس نے اپنے خاوند کے ساتھ 1903 میں بھی علم طبیعیات میں نوبل انعام حاصل کیا تھا۔ دنیا کے دوسرے ممالک نے بھی اسے بہت سے تمغے اور اعزازات دیے۔

1921 میں مادام کیوری نے امریکہ کا دورہ کیا۔ یہاں مسز ولیم براؤن مولو نے امریکی عورتوں کے درمیان ملکی پیمانہ پر ایک مہم جاری کی تھی، کہ اتنا چندہ جمع کیا جائے جس سے ایک گرام خالص ریڈیم خریدا جائے۔ اور اسے خراج تحسین کے طور پر بطور تحفہ دیا جائے۔ ایک گرام خالص ریڈیم کی قیمت 2500 ڈالر تھی۔ اس وقت مادام کیوری کے پاس اپنی تجربہ گاہ میں صرف ایک گرام ریڈیم تھا۔ چندہ جمع کیا گیا اور مشہور سائنسداں میری اس تحفہ کو قبول کرنے کے لیے اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ امریکہ آئی۔ امریکہ کے صدر نے وہائٹ ہاؤس میں یہ تحفے پیش کیے۔ اس کے علاوہ اسے امریکہ میں بے شمار دعوتیں، انٹرویوز اور اعزازی ڈگریاں دی گئیں۔

ایکسرے کی طرح سب سے پہلے ریڈیم سے علم ادویات کے شعبے میں بنی نوع انسان کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا۔ پچ بلنڈے کی بہترین کچی دھات کنیڈا کے گریٹ بیئر علاقہ میں ملتی ہے۔ لیکن ایک گرام ریڈیم پیدا کرنے کے لیے دس ٹن یہ کچی دھات درکار ہوتی ہے۔ دوسری کچی دھاتیں اس خوش اسلوبی سے ریڈیم پیدا نہیں کرتیں۔ دوسری بہترین دھات افریقہ سے سپلائی ہوتی ہے۔ مگر اس بیش بہا جوہر کا ایک گرام پیدا کرنے کے لیے اس کی دگنی مقدار صرف ہوتی ہے۔

بعد کی تحقیق کی بنیاد پر اس تازہ دریافت ریڈیم کے مطالعے سے سائنس میں ایک نئے تصور نے جنم لیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریڈیم ایک بھاری عنصر یورنیم سے پیدا ہوا ہے۔ مگر خود ریڈیم نے ایک اور عنصر ہیلیم کو جنم دیا ہے۔ یہ عنصر مادہ کی بے جان اور غیر عضویاتی زندگی میں بھی ارتقا کی ایک نئی کہانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ریڈیم کے مطالعے سے یہ دریافت ہوا ہے، کہ پرمانو اب ایک ایسا لفظ نہیں رہا جس کا مطلب ہے کہ وہ تقسیم نہیں ہوسکتا۔ پرمانو مثبت اور منفی برقی توانائی کے ذرّوں پر مشتمل ہے۔ جنھیں الیکٹرون کہا جاتا ہے یا ان ناموں پر مشتمل ہے جو "آن" کے حروف پر ختم ہوتے ہیں۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرمانو بجائے خود ایک شمسی نظام ہے۔ سائنس دانوں نے اب ایسی مشینیں تیار کر لی ہیں جو پرمانو کے ٹکڑے کر سکتی ہیں اور ہم جنگ کے دوران ایک بے پناہ قوت کا بم پہلے ہی استعمال کر چکے ہیں۔ یعنی ایٹم بم جو پرمانو کی طرف سے چھوڑی ہوئی توانائی سے تباہی پھیلاتا ہے۔

□□□

پتہ:
1071, Haveli Anwar Ali
Suiwalan, Bazaar Chitli Qabar
Jama Masjid, Delhi - 110006

لسوما

مصنف: معصوم چمکسد / مترجم: اقبال مہدی

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہماری دنیا کو نت نئی تبدیلیوں سے ہمکنار کر رہی ہے۔ بیل گاڑی سے ترقی کر کے آج انسان مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ اس کتاب میں ان ترقیات کے پیش نظر اب سے ایک ہزار سال بعد کی دنیا کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 102، قیمت -/23 روپے

مکمل موصلیت

مصنفہ: دلیپ ایم سالوی / مترجم: گوہر رضا

مکمل موصلیت (سپر کنڈکٹیوٹی) دور جدید کی ایک اہم ایجاد ہے جس سے برقی توانائی کے میدان میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ اس کتاب میں مکمل موصلیت سے متعلق تمام تفصیلات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ایجاد کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 24، قیمت: 10 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110 066

فخرالدین وحید

ماحولیاتی آلودگی اور روشنی

آج دنیا کا ہر بڑا شہر ان گنت قسم کے بلب، راڈ، قمقمے اور دلفریب و دلکش فانوس کی روشنی میں ڈوبا رہتا ہے۔ جیسے ہی شام کا دھندلکا شروع ہوتا ہے ویسے ہی مصنوعی روشنی سے تمام شہر کا سجنا اور سنورنا شروع ہو جاتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں سڑکوں پر لاکھوں بلب، عمارتوں کے سامنے لگی ہوئی مرکریاں، کاروں کی آنکھوں کو چوندھیا دینے والی لائٹیں، حفاظتی اور اشارتی بلب اور ٹاور نما بلڈنگوں کے اندر مختلف رنگ اور ڈیزائن کے چھوٹے اور بڑے حسین وجمیل بلبوں کی ٹمٹماہٹ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آسمان کے چاند ستارے، شہر کے حسن و جمال پر آب چڑھانے کے لیے شہر کے بام ودر پر اتر آئے ہوں جس میں کچھ بہت زیادہ تابناک اور روشن ہیں تو کچھ مدھم ہیں۔ یہی وہ کہکشائیں ہیں جو پورے شہر کو اپنی آغوش میں لیے رہتی ہیں اور اسی دلفریب رونق کی وجہ سے دوکان، ہوٹل اور دوسرے مقامات دیر رات تک لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں لیکن یہ زرق برق روشنی جہاں ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک، دل کو فرحت و نشاط اور ذہن و دماغ پر خوشی و مسرت کے لافانی نقوش چھوڑ جاتی ہے وہیں ہم سے اس کی بھاری قیمت بھی چکا لیتی ہے۔ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ رات کی روشنی صحت انسانی کے لیے خطرہ ہے نیز سینے کے سرطان، مایوسی اور دوسرے امراض کے روز افزوں واقعات کا اہم سبب ہے۔ بہت سے جنگلی جانوروں اور پودوں کے لیے رات میں روشنی زہریلے عناصر کے مانند ضرر رساں ہے۔

برطانوی ماہر ماحولیات الان آوٹن کے مطابق لوگوں کی توجہ اب اس طرف بڑھ رہی ہے لیکن اس کے بھیانک نتائج اس سے زیادہ ہیں جتنا محسوس کیا جا رہا ہے۔ 2001 میں امریکی اور اطالوی محققین کے بنائے ہوئے روشن آسمان کے نقشہ کے مطابق دنیا کی دو تہائی آبادی روشنی سے آلودہ فضا میں زندگی بسر کرتی ہے۔ آج جو شہر رات میں جتنی دیر تک پُر رونق اور جلوہ ریز رہتا ہے اتنا ہی ترقی یافتہ شہر مانا جاتا ہے۔ بہت سے شہر کبھی تاریک ہوتے ہی نہیں چنانچہ شمالی امریکہ کے مشرقی علاقے، مغربی یورپ، جاپان، جنوبی کوریا اور دوسرے بہت سے ممالک اور شہر مسلسل جگمگاہٹ میں ڈوبے رہتے ہیں۔

تاریک رات میں جب کوئی آسمان کی طرف دیکھتا ہے تو تقریباً 3500 ستارے، سیارے اور کہکشائیں دیکھ لیتا ہے لیکن ٹورنٹو جیسے شہر میں دکھائی دینے والے تاروں کی تعداد درجنوں میں سمٹ جاتی ہے۔ کناڈا کے فلکیات کے مشہور قلم کار ٹیرنس ڈکنسن اپنے افسوس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ''اب یہ ممکن ہے کہ آدمی بڑھاپے کو پہنچ جائے لیکن فطری خوب صورتی اور شبینہ آسمان کے جمال بے مثال سے واقف بھی نہ ہو'' پرنٹو نیوسنز افو اور ان کی ریسرچ ٹیم کے مطابق بہت سے لوگوں کی آنکھیں ہمیشہ روشنی میں رہتی ہیں۔ ان کے مطابق دنیا کے دس فیصد لوگ بشمول ساٹھ فیصد کناڈا کے وہ باشندے جو بہت زیادہ روشنی سے آلودہ علاقے میں مقیم ہیں۔ ان کے ذہن و دماغ کے خانوں سے رات کا تصور ختم ہو چکا ہے اور تاریک رات ان کے لیے ایک خواب بن چکی ہے۔

تیز روشنی دوسری مخلوقات پر بھی اپنا اثر ڈالتی ہے۔ مہاجر پرندے گھبرا کر روشن ٹاوروں اور روشنی سے چمکتی ہوئی پرشکوہ عمارتوں سے جا ٹکراتے ہیں اور صرف شمالی امریکہ میں ہی لاکھوں پرندے اس طرح موت کے شکار ہو جاتے ہیں۔ علاقائی ماحولیاتی ذرائع کے مطابق صرف ٹورنٹو شہر میں اونچی عمارتوں سے ٹکرا کر مرنے اور زخمی ہونے والے پرندوں کی سالانہ تعداد 24000 تک پہنچتی ہے۔ سمندروں کے چمکتے ہوئے ساحل کا شکار کچھوے کے لاکھوں بچے ہوتے ہیں۔ کچھوے فطرتاً چمکدار چیز کی طرف رینگتے ہیں عموماً سمندر کے صاف اور شفاف پانی پر چاند اور تاروں کی کرنیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں لیکن جہاں ساحل مختلف قسم کی روشنی میں نہایا رہتا ہے تو اس کی خوب صورت کرنوں سے چمکتی ہوئی سڑک کچھوے کے بچوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے جس کی وجہ سے یہ بچے سڑکوں پر آ جاتے ہیں اور اکثر گاڑیوں سے کچل جاتے ہیں یا پھر رات بھر خشک ساحل پر ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں اور اپنی جان گنوا دیتے ہیں۔

نیویارک میں بایولوجی کے پروفیسر بریانت بچن کی تحقیق کے مطابق رات کے وقت جلتی ہوئی ہلکی روشنی میڈکوں کی چشم بینا کو ناکارہ بنا دیتی ہے۔ حیاتیات کے ماہرین کے مطابق رات کی روشنی کی وجہ سے جانور اپنے علاقے چھوڑنے اور غیر معقول جگہوں کو اپنا مقام بنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ سمندری کچھوے، پرندے اور دیگر جانور رات کی روشنی کے باعث مختلف قسم کے خطرات سے دوچار ہوتے ہیں۔

امریکی وبائی امراض کے ماہر رچارڈ اسٹون کا خیال ہے کہ رات کی روشنی اہم ہارمون کی سطح کو کم کر دیتی ہے جس سے صحت انسانی کا متاثر ہونا

ناگزیر ہے۔ اسٹون اس نتیجہ پر اس وقت پہنچے جب وہ اس معمے کو حل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ آخر کیوں صنعتی سوسائٹی میں ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے سینے کے سرطان کا خطرہ پانچ گنا زیادہ ہے۔ سرکیڈین تناسب یعنی معمولاتِ زندگی مثلاً اپنے وقت پر بھوک لگنا اور اپنے وقت پر قضائے حاجت کا تقاضہ وغیرہ جن کی رہنمائی حیاتیاتی گھڑی کرتی ہے اور ملاٹونین جو ایک قسم کا ہارمون ہے ان دونوں کے گہرے مطالعے کے بعد اسٹون اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ہلکی روشنی والا بلب بھی انسانی صحت پر اثر انداز ہوسکتا ہے کیونکہ ملاٹونین کی پیدائش مکمل تاریکی میں ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ملاٹونین تناسب میں کمی، لاانتہا ہی مرض، مایوی اور حوصلہ شکنی، پیدائشی نظام میں بے قاعدگی، حتیٰ کہ کینسر تک پہنچاسکتی ہے اور جو عورتیں روشنی میں زیادہ کام کرتی ہیں جیسے نرس وغیرہ ان میں سینے کے سرطان کا اندیشہ عام عورتوں کے مقابلے میں 60 فیصد زیادہ ہوتا ہے۔ اسٹون کی تحقیق کے مطابق نابینا عورت میں سرطان کا اندیشہ 20 سے 50 فیصد تک کم ہوتا ہے اور جس کی بینائی میں جتنا نقص ہوگا اتنا ہی اس میں سرطان کا اندیشہ کم ہوگا اور اس کی اصل وجہ ملاٹونین ہے جس کی پیداوار دماغ کے پائنیل گلینڈ میں اس وقت ہوتی ہے جب آنکھ اندھیرے اور تاریکی میں ہوتی ہے۔ اس کی پیدائش کا سلسلہ رات کی آمد کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ ایک اور دو بجے رات میں یہ اپنے شباب پر ہوتا ہے اور سورج کی تابناک کرنوں کے ساتھ ہی یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، اس لیے جو لوگ رات میں روشن جگہوں پر کام کرتے ہیں ان میں ملاٹونین کی نشو و نما کم ہوتی ہے اسی لیے نابینا عورت میں ملاٹونین کے صحیح تناسب کی وجہ سے سرطان کے خطرات کم ہوتے ہیں جب کہ رات میں کام کرنے والے افراد زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اسٹون کے مطابق ان عورتوں میں سرطان کے خدشات زیادہ ہیں جو روشن کمروں میں سوتی ہیں یا جہاں اتنی روشنی ہوتی ہے جس میں کتاب وغیرہ بہ آسانی پڑھی جا سکے۔ اس تحقیق کے مطابق بڑے شہروں کی دن نما راتیں اور روشنی کی زرق برق چادر خطرات کے دہ محرکات ہیں جن کی جانب دفاعی اقدامات اشد ضروری ہیں کیونکہ ہارمون کی سطح اگر اسی طرح روز بروز گھٹتی رہی تو زندگی کے مراحل دشوار گزار ہو سکتے ہیں۔

چوہے اگر رات میں تھوڑی دیر روشنی میں رہ جائیں تو ان میں نیومر گروتھ کی وہی سطح ہوتی ہے جو دوسرے کترنے والے جانوروں کے چوبیس گھنٹے روشنی میں رہنے پر ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے انسان، ان جانوروں کے مقابلے کم حساس ہے جس کی وجہ سے اس کے اثرات کم دکھائی پڑتے ہیں۔ بعض افراد رات کی روشنی کے ذیل میں زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ تیز روشنی کے خطرناک نتائج کو دیکھتے ہوئے کچھ احتیاطی اقدام اٹھانا ضروری ہے۔ مشہور سائنس داں ٹراوس لانگ کور کے مطابق ہمیں روشنی کی آلودگی پر اتنی ہی توجہ دینی چاہیے جتنی ہم دوسری ماحولیاتی آلودگیوں پر دیتے ہیں۔

ماحولیاتی ماہرین کے مطابق 1960 سے ہر سال روشنی کے باعث آلودگی میں دس فیصد کا اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ کناڈا نے سب سے پہلے اس سمت میں حفاظتی اقدامات کیے ہیں اور شمالی ٹورنٹو میں ایک کنزرویشن ریزرو قائم کیا ہے۔ امریکہ میں بھی اس ضمن میں کوششیں جاری ہیں کہ مدھم روشنی کو عام کیا جائے اور ایسے بلب لگائے جائیں جس سے روشنی افق پر نہ پہنچے تاکہ ماحولیات کو روشنی کی آلودگی سے بچایا جا سکے۔

□□□

پتہ:
112, Mandavi Hostel
J.N.U. New Delhi-110067

بابرنامہ

تلخیص کار اور مترجم: ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی

''تزک بابری'' کی تلخیص اور آسان اردو میں ترجمہ۔ یہ تلخیص ان حصوں پر مشتمل ہے جن میں بابر نے بہ طور خاص ہندستان کے رسم و رواج، یہاں کے موسموں، یہاں کی آب و ہوا یہاں کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے خصوصی دلچسپی کی حامل ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 101 صفحات، قیمت 15.00 روپے

برنارڈ شا

مصنف: عبدالمغنی

جارج برنارڈ شا ایک روشن خیال اور انسان دوست ادیب اور مفکر تھا جو نسل یا قومیت کی حد بندیوں سے نکل کر پورے عالم انسانیت کی بہتری کا خواہاں تھا۔ اس کتاب میں برنارڈ شا کے شخصی اور ادبی اوصاف تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 96 صفحات، قیمت 35.00 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

فرزانہ اسد

جنگلات کا تحفظ

قدرت نے انسان کو اپنی نعمتوں کے بیش بہا خزانے عطا کیے ہیں، جنگلات بھی انھی میں شامل ہیں۔ انسان کی بے شمار ضروریات انھی جنگلات کی مرہونِ منت ہیں۔ نباتات کو زمین کے منظرنامے سے خارج کر دیا جائے تو انسانی زندگی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ جنگلات ہماری غذائی ضروریات کے علاوہ ایندھن، غلہ، پھل، پھول اور ادویات کے علاوہ ایندھن کے طور پر استعمال ہونے والی لکڑی مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ جانوروں، چرندوں اور پرندوں کا مسکن بھی ہیں۔ علاوہ ازیں حیوانی زندگی کا وجود انسان کی سماجی، نفسیاتی اور جمالیاتی زندگی کی تکمیل کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اگر جنگلات صفحۂ ہستی سے مٹ گئے تو ان کے ساتھ حیوانی زندگی کا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔ راستے میں سایہ دار درختوں کا وجود نہ صرف مفید ہے بلکہ فرحت بخش بھی ہے۔ انسانی زندگی کے سفر میں بھی یہی درخت ایک وفادار، مخلص اور معاون دوست کی طرح ہر قدم پر موجود ہیں۔

ہندوستان کی آبادی کا 22 فیصد حصہ قدرتی جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے۔ دنیا کے نقشے میں، خصوصاً براعظم افریقہ میں بڑے بڑے جنگلات موجود ہیں۔ انیسویں صدی میں یوروپ میں صنعتی ترقی کا آغاز ہوا۔ سائنسی ایجادات نے اس ترقی کو عروج بخشا۔ اس کے نتیجے میں شہری آبادکاری کا عمل بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ اس ترقی و تعمیر میں خرابی کی یہ صورت پیدا ہوئی کہ بڑے پیمانے پر جنگلات کاٹے گئے اور اسی صنعتی ترقی کے روز افزوں ہونے کے سبب پوری دنیا میں جنگلات کا بڑی تیزی سے صفایا ہو رہا ہے۔ چونکہ درخت ماحولیات کے توازن کو برقرار رکھنے، بارش کے آنے اور زمین کے کٹاؤ کے عمل کو روکنے میں بڑے معاون ثابت ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ 1950 سے 1990 تک دنیا کی آبادی دگنی ہوگئی۔ انسانی آبادی کے ساتھ اس کے رہنے سہنے اور اس کی دیگر ضروریات میں بھی اضافہ ہوا جن میں درختوں کا استعمال ایندھن، فرنیچر، مکانات اور دیگر بہت سے کاموں میں بڑھتا گیا۔

جنگلات میں ہونے والی کمی کے باعث موسم میں جو تبدیلی رونما ہوئی اس سے جب ماہرین ماحولیات نے واقف کرایا تو پوری دنیا نے قدرتی جنگلات کے کاٹے جانے کو ایک بھیانک خطرے کے طور پر محسوس کیا اور ساری دنیا میں جنگلات کے تحفظ کے لیے ایک مہم چھیڑ دی۔

یہ وہی زمانہ ہے جب ایندھن کے طور پر لکڑی جلائی جاتی تھی۔ ایک رپورٹ کے مطابق ترقی پذیر ممالک میں 90 فیصد دیہی آبادی ایندھن کے طور پر لکڑی کا استعمال کرتی رہی ہے۔ ہر سال جنگلات کا 82 کروڑ 50 لاکھ مربع میٹر رقبہ نذرِ آتش کیا جاتا ہے۔ بجلی اور گیس کے استعمال کی وجہ سے ایندھن کے طور پر جلائی جانے والی لکڑی کا استعمال کم ہوا ہے، یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ البتہ اس کے باوجود درختوں کی کٹائی کا کام جاری ہے۔ فیکٹریوں کے قیام اور شہروں کو بسانے کے علاوہ عمارتی لکڑی اور دیگر ضروریات کے لیے لکڑی حاصل کرنے کے لیے اب بھی بڑے بڑے جنگل کاٹے جاتے ہیں۔

ان جنگلات کی کٹائی کو روکنے کی غرض سے عالمی پیمانے پر حکومتیں اور فلاحی ادارے سرگرم عمل ہیں۔ لیکن ان کی کوششوں کے باوجود جنگلات جس تیزی سے ختم ہو رہے ہیں، وہ پوری انسانیت کے لیے ایک خطرے کی گھنٹی ہے۔ بیشتر حکومتوں نے اور خصوصاً ہمارے ملک میں بھی ہرے بھرے اور بڑے پیڑوں کو کاٹنے کے لیے حکومت کی اجازت ضروری ہے۔ بعض پیڑوں کا کاٹنا بھی ممنوع ہے۔ اس کے باوجود قانون کی خلاف ورزی کرنے والے قانون کی گرفت سے دور رہتے ہیں۔ درختوں کی کٹائی سے ہونے والی کمی کو پورا کرنے کے لیے دو طرح کے اقدامات کیے جارہے ہیں۔ ایک درختوں کو بچانے کی کوشش اور دوسری نئے پیڑ لگانے کی مہم۔

درختوں کو بچانے کی کوششوں میں 'چپکو آندولن' کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہ ماحولیات کے توازن کو برقرار رکھنے اور فضائی آلودگی کی روک تھام کے علاوہ خصوصی طور پر جنگلات کے تحفظ کے لیے خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کا مقصد عوام میں جنگلات کے تحفظ کے لیے بیداری پیدا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے سرکاری اور تعلیمی اداروں کے ذریعے بھی جنگلات کے تحفظ کے لیے عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ سرکاری دفاتر کے آس پاس

درخت لگانے کی مہم انتظامیہ کی جانب سے شروع کی گئی ہے جس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آرہے ہیں۔ اسکولوں، کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں طلبہ کے ذریعے پودے لگوانا، ریلیاں اور جلوس نکالنے کے علاوہ، شجر کاری کی حمایت میں نعرے لگواکر ان میں یہ احساس جگایا جاتا ہے کہ وہ جنگلات کی اہمیت سے واقف ہوں اور ان کو بچانے میں معاون و مددگار ثابت ہوں۔

شجر کاری کی مہم خواہ وہ سرکاری اداروں کی جانب سے چلائی جائے یا تعلیمی اور انفرادی اداروں کی طرف سے، اس سے نئے پیڑ پودے وجود میں آنے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن جنگلات کی کٹائی سے شجر کاری مہم کا موازنہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک پودے کو درخت بننے میں برسوں لگ جاتے ہیں، اس لیے جہاں نئے درخت لگانا ضروری ہے، وہیں جنگلات کی کٹائی کو روکنا بھی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

□□□

پتہ:
30, Gulistan Colony
Police Lane Takli
Nagpur-440013 (Maharashtra)

کلیات محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: سیّدہ جعفر

گولکنڈے کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بنیاد گزار قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا قدر شناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیّدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈے کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات: 823، قیمت -/175 روپے

کلیاتِ سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جاسکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

کلیاتِ عیش

مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو

حکیم آغا جان عیش دہلوی ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ کے ہم عصروں میں تھے اور بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ غالبؔ کی مشکل پسندی پر ان کا طنزیہ قطعہ ''مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے'' مشہور ہے مگر غالبؔ کی وفات پر انھوں نے جو تاریخی قطعہ بند اشعار کہے ہیں، وہ غالبؔ سے ان کی محبت و مودّت کو ظاہر کرتے ہیں۔ عیش خوش فکر شاعر تھے اور انھوں نے اپنا مرتّب دیوان غزلیات اپنی زندگی ہی میں مرتب کرلیا تھا، ڈاکٹر حبیبہ بانو کے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ دیگر اصناف سخن بھی ہیں جو عیش سے یادگار ہیں۔ مفصل مقدمے کے ساتھ۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 556، قیمت: -/80 روپے

گلشن بے خار

مصنف: نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ نے بہ زبانِ فارسی قلمبند کیا تھا اور اس کے بعض بیانات، اس دور کے شعرا کا ذکر آئے تو آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہوگیا ہے۔ اس اہم تذکرے کو جو متقدمین سے شیفتہ کے زمانے تک کے ساڑھے چھ سو سے زائد شعرا اور شاعرات کے مختصر کوائف اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے، محترمہ حمیدہ خاتون نے اصل کتاب کے مستند نسخوں کو سامنے رکھ کر سلیس اردو میں منتقل کیا ہے اور شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 430، قیمت -/128 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110 066

صادقہ نواب سحر

مجروح سلطانپوری

اکثر یوں ہوتا ہے کہ انسان اپنی پہچان ساری دنیا میں تو کروالیتا ہے مگر اپنے ہی گھر میں وہ ایک اجنبی شخصیت بن کر رہ جاتا ہے اور پھر اتفاقاً شاعر ہوگئے تو بات ہی کیا ہے۔..... ''بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے''..... بہت کم ایسے ہوئے ہیں جو گھر اور باہر دونوں جگہوں پر قابل وقعت، قابل محبت اور قابل اعتماد ہوتے ہیں۔ شاعر اور گیت کار مجروح سلطان پوری انھی چند خوش قسمت لوگوں میں سے تھے۔ وہ ہر جگہ کامیاب رہے۔ بحیثیت ادبی شاعر، بحیثیت علمی شاعر، بحیثیت صاحب خاندان۔ انسان باہر کی دنیا میں کتنا ہی کامیاب رہے، اگر وہ گھر میں کامیاب نہیں تو وہ ادھورا ہے۔

مجروح صاحب گھر میں رہے یا باہر ان کو اپنے بیوی بچوں، رشتہ داروں، دوستوں کا ہمیشہ خیال رہتا۔ مجروح اپنے بچوں کو مشاعروں میں لے جانا پسند نہیں کرتے تھے البتہ شاعری کے مختلف پہلو انھیں ضرور سمجھا دیا کرتے تھے۔ تعجب ہوا یہ جان کر کہ انھوں نے اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھائی، شاعری کے لیے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی اور بچوں نے بھی اس طرف خاص دھیان نہیں دیا۔ I.C.S.C. اسکول کی پڑھائی اور ہوم ورک میں ہی ان کا وقت نکل جاتا تھا! شاید مجروح صاحب اپنے بچوں کو زمانے کی ٹھوکروں سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے!!

بچوں کی پڑھائی اور تربیت میں وہ سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ کبھی کبھار اسکول والوں کی کسی کوتاہی کا احساس ہوتا تو اسکول جاکر پرنسپل اور ٹیچروں کو ڈانٹ آتے۔

وہ بیچارے لحاظ میں خاموش ہو جاتے اور بچے دل ہی دل میں ناموزوں ماحول سے دوچار ہو جاتے۔ مگر اکثر جب وہ اسکول کے کسی جشن میں شیروانی، سفید کرتا، پاجامہ پہن کر جاتے تو بچوں کو محسوس ہوتا کہ پروگرام کی رونق ہمارے والد سے ہے اور یہ صحیح بھی ہوتا۔

مجروح صاحب کی تین بیٹیاں تھیں نوگل، نوبہار اور صبا اور دو بیٹے ارم اور عندلیب۔ نوگل کینڈا میں ہیں۔ ان کی شادی بھوپال کے بیرسٹر صبا رشید قاضی کے بیٹے وقار قاضی سے ہوئی۔ نوبہار ظ. انصاری صاحب کے بیٹے خورشید سے بیاہی گئیں۔ صبا، موسیقار نوشاد صاحب کے موسیقار بیٹے راجو نوشاد کی بیوی ہیں۔ تین بیٹیوں کے بعد ارم کی پیدائش ہوئی تو مجروح صاحب نے شکیلہ بانو بھوپالی کی قوالی کا پروگرام رکھا۔ ارم جنھیں پیارے ننو کہتے تھے، ہارٹ اٹیک کا شکار ہوکر بھری جوانی میں اس دنیا سے سدھار گئے۔ یہ ایس.ایم. ساگر کی بیٹی سے بیاہے گئے تھے۔ دوسرے بیٹے عندلیب نے فلم لائن جوائن کی۔ ''جانم سمجھا کرو'' بنائی، لیکن والد کے انتقال کے بعد داڑھی بڑھائی اور اسلام سے قریب ہوگئے۔

جگر صاحب سے مجروح کی قربت اور محبت مشہور ہے۔ ایک بار جگر نے ننھی صبا کو ایک روپے کا نوٹ دیا تھا۔ مجروح صاحب نے صبا کی تصویر کے نچلے حصے میں نوٹ فریم کروا دیا۔ مگر ایک دن کسی نوکر نے اس نوٹ کو چرالیا۔ یہ واقعہ سناتے ہوئے صبا کی آنکھوں میں والد کے لیے محبت اور بچپن کی یادیں ابھر آئیں۔

مجروح صاحب کے سر پر چشمہ ٹوپی رہتی، گرمی کے موسم میں بھی سویٹر، مفلر، ساتھ رکھتے وجہ سردی کی شکایت۔ انھیں سر میں بہت سردی محسوس ہوتی تھی۔ صبا کے گھر جاتے تو سیدھے نوشاد صاحب کے میوزک روم میں چلے جاتے۔ صبا کو بعد میں خبر ہوتی۔ اکثر شام کو چار بجے وہاں جاتے۔ باہر ہال میں صبا بیٹھی انتظار کرتی۔ نوشاد صاحب کی دوستی انھیں اتنی ہی عزیز تھی۔ جب وہ ممبئی آتے تھے تو دادر کی ایک چال میں نوشاد صاحب کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ اس وقت وہ مجروح تھے نہ نوشاد نوشاد سے ایسی یاری نبھائی کہ رشتہ داری تک پہنچائی۔

آج رضوی کالج باندرہ کے پڑوس میں 'سی گل بلڈنگ' میں مجروح صاحب کے گھر میں ان کی بیگم فردوس صاحبہ اور عندلیب اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہاں بھی اور اس سے پہلے Lido سنیما کے قریب جوہو کے گھر میں بھی ان کے رشتہ داروں کا آنا جانا لگا رہتا۔ کچھ کو وہ گاؤں سے اپنا کیریئر بنانے کے لیے بلا لیتے۔ نوکری اور گھر ملنے پر ہی وہ وہاں سے رخصت ہوتے۔ ان کے ایک رشتہ دار مشتاق جو ان کے سکریٹری بھی تھے۔ آخر وقت تک ان کے ساتھ رہے۔ مجروح صاحب کی وفات کے چوتھے دن یعنی 21 جون کو ان کا جنازہ بھی اٹھا۔

شاعری کے علاوہ مجروح صاحب کو کچھ اور شوق بھی تھے۔ جیسے شکار کھیلنا، تاش کھیلنا، اچھا کھانا، فیملی کے ہمراہ سیر وتفریح ٹی.وی. پر کرکٹ اور ہاکی میچ دیکھنا۔ شکار کے سلسلے میں اکثر بھوپال میں اپنے دوست اختر سعید خاں کے یہاں جایا کرتے۔ مچھلی کے شکار کا بھی شوق تھا۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ قصہ یوں ہے کہ ممبئی کے پوائی لیک میں، جہاں وہ اکثر مچھلی کا شکار کیا کرتے تھے، ایک بار پوری رات گزار دی۔ آخر مجروح کے کانٹے میں ایک باون پونڈ کی مچھلی لگی۔ مجروح صاحب چھوٹی بوٹ لے کر صبح تک اسے باہر نکالنے کی کوشش کرتے رہے اور کامیابی پائی۔

مجروح صاحب کو لکھنوی کھانا بڑا پسند تھا۔ بیگم فردوس اصلی گھی میں بڑا اچھا کھانا پکاتیں اور وہ بڑے شوق سے کھاتے۔ گو کہ بہت کم کھاتے.... مجروح صاحب حقہ بھی بہت شوق سے پیتے۔ شام کو آنگن میں بیٹھے ہیں، ہولے (ہرے چنے) لہسن کی چٹنی کے ساتھ چٹخارے لیتے ہوئے کھا رہے ہیں۔ حقہ بھی چل رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب بیگم رشید احمد صدیقی سے شب دیگ پکواتے، کباب، قورمہ، روغنی روٹی کے ساتھ کھاتے۔ چاول زیادہ نہ کھاتے۔ چاول میں صرف پلاؤ پسند تھا۔ بھنا قیمہ خاص طور سے پسند تھا۔ شکار کا گوشت خصوصاً تیتر، بٹیر، کلیجی وغیرہ آگ پر بھنوا کر کھاتے۔ اخیر میں لیلاوتی اسپتال میں داخل کیے گئے تو بگڑتے پرہیزی کھانے سے بیزار تھے۔ سترہ مئی کو ایڈمٹ ہوئے 20 کو گھر آئے، جیسے گھر کا کھانا کھانے ہی آئے ہوں۔ 21 مئی کو دوبارہ ایڈمٹ کیے گئے اور 23 کی رات انتقال کیا۔

مجروح صاحب کو اپنے گھر والوں سے اس قدر لگاؤ تھا کہ جہاں جہاں ممکن ہوتا بیوی بچوں کو ساتھ لے جاتے۔ آج فردوس صاحبہ ذرا سا شوہر کی بات نکلنے پر روتی بلکتی ہیں وقت مرہم نہیں بن پایا تو کیا عجب ہے۔ پچھلے دنوں پروڈیوسر، ڈائرکٹر ناصر حسین کا انتقال ہوا تو جیسے پرانی یادیں لوٹ آئیں۔ مجروح صاحب نے ناصر حسین کے ساتھ کئی فلمیں کی تھیں۔ بے قرار ہونے لگیں۔ مجروح صاحب کے گیت ٹی.وی. پر دیکھ سن کر یادوں کی ریل پھر الٹی چلنے لگی۔ مجروح صاحب اپنی بیگم کو یوروپ، کینڈا، جہاں جہاں فلم والے یا ادبی ادارے ٹکٹ دیتے تھے، ہر جگہ لے گئے۔ ”پکار“ فلم تک وہ ان کے ساتھ جاتی رہیں۔ پھر صحت کی خرابی کی وجہ سے اس میں کمی واقع ہوئی۔

مجروح صاحب کو 30 ستمبر 1994 میں 93 کا دادا صاحب پھالکے ایوارڈ لینے دلی جانا تھا۔ بچوں کو بھی لے گئے۔ ہر سال چنڈی گڑھ میں ”جشن رفیع“ کے موقع پر بہترین گلوکار کو ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ مجروح صاحب کے ہاتھوں ایوارڈ دیا جانا تھا۔ وہاں گئے تو منتظمین سے کہا کہ بیٹی صبا کو شملہ گھما لاؤ۔ انھوں نے شملہ کی سیر کروانے کے ساتھ ساتھ مشاعرے کا انتظام بھی کر لیا۔ مذاقاً کہتے، ”صبا تمھاری بدولت ہم نے شملہ دیکھ لیا۔“ بچیوں کی شادی کے موقعوں پر خود انھیں لے جاتے اور شاپنگ کرواتے۔

مجروح صاحب دوست نواز بھی تھے۔ راہی معصوم رضا، سلمیٰ صدیقی کے علاوہ بہت سی فلمی ادبی اور غیر فلمی لوگوں سے دوستی ہوئی اور اسے نبھایا بھی۔

مجروح صاحب آخری وقت تک تنومند رہے۔ لیلاوتی میں بھی انھیں یقین تھا کہ سنبھل جائیں گے۔ یہی جینے کی للک ان میں زندہ دلی بھرتی رہی۔ عمر اور کمزوری سے ہاتھوں میں رعشہ تھا مگر اپنی وفات سے دو مہینے پہلے تک گاڑی خود چلاتے تھے۔ بچے منع کرتے کہ ہاتھوں میں لرزش ہے تو انھیں ڈانٹتے۔

مجروح صاحب ادب اور فلم کی بڑی شخصیت ہیں مگر وہ اپنی بڑائی کو گھر نہیں لائے تھے۔ گھر میں وہ صرف باپ تھے، نانا، دادا تھے، شوہر تھے۔ گھر کے ہیڈ، جن کے سہارے اور بھروسے گھر چلتا ہے۔ باہر جو جدوجہد کریں سو کریں۔ آپ کے رشتوں پر اس کا کوئی اثر نہیں۔

زی ٹی.وی. والوں نے "Making of Legend" پروگرام کے لیے جب عندلیب سے پوچھا کہ تمھارے ابا تمھیں کیسے لگتے ہیں تو انھوں نے بڑے فخر سے کہا تھا "Best in the world" یہ نہیں کہ وہ بہت بڑی جائداد چھوڑ گئے ہوں یا دنیا کی تمام نعمتیں بچوں کی جھولی میں ڈالی ہوں۔ مگر یہ تو تھا کہ کسی چیز کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔ عندلیب نے مجھ سے کہا کہ آج کروڑپتیوں کے بچے خودکشی کرتے ہیں کیوں کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انھیں طمانیت نصیب نہیں۔ ہم میں ابا نے وہ کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ گھر میں کبھی فلمی ماحول نہیں رہا۔ شعر خوانی بھی تبھی ہوتی جب مہمان گھر آتے۔

مجروح صاحب کی غصے کے تعلق سے کئی روایتیں مشہور ہیں۔ کچھ جان پہچان والے ان سے نالاں بھی رہے لیکن بات کچھ ایسی تھی کہ آخری وقت تک انھیں کام کرنا پڑا۔ لہٰذا کچھ چڑچڑے ہو چلے تھے۔ شروع کے دن جدوجہد کے گزرے۔ پہلی تین بیٹیاں تھیں ایک ایک کر کے تینوں کی شادی کی بیٹے چھوٹے تھے۔ کس کے Support پر آرام کرتے۔ ارم کی موت کے بعد اکثر کہتے ”خدا کسی باپ کے کندھے پر بیٹے کا جنازہ نہ اٹھوائے“ آخر میں اس بات کا بھی چڑچڑاپن تھا کہ عندلیب کا کچھ کیوں نہیں بن رہا۔ انھیں کام مانگنے کی عادت نہ تھی مگر خوش قسمت تھے۔ اسپتال میں بھی جتن للت کا اسی سلسلے میں فون آیا تھا۔ زندگی یوں گزرتی رہی کہ روز کنواں کھودو اور روز پانی پیو۔ فکر تھی کہ میرے بعد ان سب کا کیا ہوگا؟ کبھی اس بات کا غصہ نہ تھا کہ بوڑھے سے

کام کر دار ہے ہیں یا ہم نے انھیں سہارا دے رکھا ہے۔ اس قسم کی بات نہ کبھی دوستوں سے سنی گئی نہ رشتہ داروں سے۔ عندلیب نے بڑے دکھ سے کہا کہ 'ہم ہی کھڑے ہو جاتے تو وہ Relax کر لیتے۔

مجروح صاحب اپنے بچوں کے بچپن کو اپنی فلمی و ادبی مصروفیات کی نذر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے بچوں نے جو خود اب چھوٹے یا بڑے بچوں کے ماں باپ ہو چکے ہیں۔ اپنی یادوں کے جھروکوں سے جھانک کر کہا کہ ہم بیمار پڑتے تو دوہری خوشی ملتی، ایک تو اسکول سے چھٹی ملنے کی دوسرے امپورٹیڈ کھلونے پانے کی، جو اس زمانے میں بہت مہنگے ہوتے۔

بچوں کو وہ اداس نہیں دیکھ سکتے تھے۔ فلم ''جانم سمجھا کرو'' میں پس منظر موسیقی کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی کہ موسیقار اور پروڈیوسر میں کہا سنی ہو گئی اور ایک بہت اہم سین رہ گیا۔ پروڈیوسر نے میوزک ڈائرکٹر کو پیسے دینے سے انکار کر دیا۔ ان دنوں مجروح صاحب ''مشعل جاں'' کے نام سے اپنا مجموعۂ کلام شائع کروانے کے لیے پیسے اکٹھے کر رہے تھے۔ انھوں نے گھر میں سختی سے کہہ رکھا تھا کہ اتنے پیسے میرے ہیں۔ کسی ضروری کام کے لیے بھی صرف نہ کیے جائیں۔ مگر فلم کی تکمیل کے اس مرحلے میں انھوں نے عندلیب کو قریب بلایا، سارے پیسے نکال کر انھیں دے دیے اور کہا اپنی موسیقی کمپلیٹ کرلو۔

مجروح صاحب مغرور نہیں تھے، خوددار ضرور تھے۔ مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ منوہر جوشی کے ہاتھ سے دادا صاحب پھالکے ایوارڈ نہیں لیا، لیکن معروف شاعر جگر مرادآبادی کے پاؤں ضرور دباتے۔ وہ مذہب کے نام پر ماحول خراب کرنے کے عمل کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ دوسروں کی مدد کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔ ساحر لدھیانوی کی بیماری کے دنوں میں ان کی طرف سے فلموں میں گیت لکھے اور محنتانہ بھی نہیں لیا۔ نظیر بنارسی اور محمد علی تاج وغیرہ کو فلم پروڈیوسروں سے متعارف کروایا۔ وہ خوبصورت شخصیت، سریلے گلے کے مالک، مہذب، مشفق، اخلاق کی قدروں کی علامت تھے۔

مجروح صاحب کی بیماری کی خبر نہیں پہنچی، انتقال کی خبر ملی۔ ان کے انتقال سے صرف پانچ مہینے پہلے میں اپنے شوہر اسلم نواب صاحب کے ساتھ ان سے مل آئی تھی۔ اپنی بلڈنگ کے میٹریس پر شام کی چہل قدمی کے لیے گئے تھے۔ ہمارے ساتھ ہی گھر لوٹ آئے ''مشعل جاں'' تحفتاً دی۔ اپنے ہاتھوں سے اس پر لکھا: ''صادقہ بیٹی کے لیے۔''

ان کی وفات کی خبر اخباروں کے ذریعے پہنچی تھی...... میں دوڑ پڑی 'سی گل' کے 'سی ونگ' کے ناموں کی تختیوں کے نیچے لاکھوں دلوں کی دھڑکنیں اپنی ادبی غزلوں اور میٹھے فلمی گیتوں سے بڑھانے والا زندہ دل شاعر — مجروح بڑے سکون سے سو رہے تھے۔ لگا جیسے ابھی بول پڑیں گے 'ٹھیک تو ہو بیٹا' اور پھر '' آواز دیں گے، 'ارے بھئی، صادقہ آئی ہے، چائے وائے پلاؤ'— مگر اس دن ایسا کچھ نہیں ہوا۔

ان کی چھوٹی بہو ناظمہ بتا رہی تھیں۔ '' اندازہ ہی نہیں ہوا کہ ایسا کچھ ہو جائے گا۔''

بہت کم لوگ سو سے بھی کم، عمارت کے احاطے میں نظر آئے۔ لوگوں کو خبر ہی نہیں ہوئی اور ایک اہم ادبی ہستی اور ہزاروں فلمی گیتوں کا خالق، جن کی موجودگی ہزاروں لوگوں کو اکٹھا کر لیتی تھی، چند چاہنے والوں کی موجودگی میں منوں مٹی کے نیچے سلا دیا گیا۔

کبھی کبھی اس ملک کا ذولسانی ہونا ایک طرح سے ہماری بدقسمتی بن جاتا ہے جب ایک زبان کی قابلیت دوسری زبان والوں تک پہنچ نہیں پاتی۔ مہاراشٹر کالج کے ایک مشاعرے میں میں نے مجروح صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا کلام دیوناگری رسم الخط میں چھپوائیں تاکہ ملک کے کونے کونے میں پہنچے۔ ان کے اشعار لوگوں کی زبانوں پر تو ہیں مگر بہت سے لوگ انھیں پڑھ نہیں پاتے۔ اردو میں بھی ان کا کلام پورا کا پورا نہیں آپایا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے مجھ سے کہا: تم ہی یہ کام کیوں نہیں کر لیتیں۔ مجروح صاحب نے حوصلہ افزائی کی۔ انھی کی سرپرستی میں میں نے دو برسوں میں یہ کام مکمل کیا۔ یہ کلیات سارانش پرکاشن دلی سے ''پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ'' کے نام سے 2002 میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد والی پرکاشن دلی سے ان کی غزلیات اور غزل نما گیتوں کا مجموعہ ''لوک پر یہ کوی'' مجروح سلطان پوری'' کے نام سے 2002 میں شائع ہوا۔ ان دو کتابوں کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی ترتیب دے رہی ہوں۔

فروری 1992 میں جب میں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی کھوپولی شاخ کا افتتاح کیا تو میرے بلانے پر وہ سلمٰی صدیقی صاحبہ اور یوسف ناظم صاحب کے ساتھ تشریف لائے۔ پٹرول کے پیسے تک قبول نہیں کیے۔ یقین جانیے، پنویل اور لوناولہ، کرجت تک سے لوگ بغیر دعوت نامہ، فون یا پبلسٹی کے انھیں دیکھنے اور سننے آئے۔ یہ تھی مجروح صاحب کی عوامی مقبولیت!

□□□

پتہ:
Mohsin Manzil, 1st Floor
Shastri Nagar
Khopoli-410 203 (Maharashtra)

سمیع الرحمن

ٹیلی ویژن نیوز

ٹیلی ویژن کی خبریں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی کثیر آبادی کے لیے اطلاعات حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ بظاہر آسان دکھائی دینے والا یہ ذریعہ نہایت دشوار گزار اور سخت مقابلہ آرائی کا محاذ ہے۔ بے حد چیلنجنگ اور تھکا دینے والا جس میں ہر شخص کو جو ذمے داریاں دی جاتی ہیں اسے انجام دینا از حد ضروری ہے اور نہایت خوش اسلوبی سے اور وہ بھی معینہ وقت پر۔ یہاں فرد واحد کی غلطی بھی پوری ٹیم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اگر کسی شخص نے اپنا کام سلیقے سے نہیں کیا تو اس پر محض کچھ لوگوں کی نگاہیں نہیں پڑیں گی بلکہ ناظرین کا پورا حلقہ اس سے واقف ہو جائے گا جس کی تعداد چند لاکھ سے لے کر کروڑ تک ہوسکتی ہے۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ خبر کی پہنچ کا دائرہ کہاں تک ہے۔ ایسے میں جو شخص بھی اس پیشے میں قدم رکھنا چاہتا ہے اسے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کوئی آسان پیشہ نہیں۔ کام کے اوقات دیر طلب ہوتے ہیں، کیریئر کے ابتدائی دنوں میں تنخواہ بھی معقول نہیں ہوتی۔ اس پر طرہ یہ کہ ٹیلی ویژن صحافی نیوز روم کے کام کو پوری طرح سے نپٹا کر ہی گھر لوٹتا ہے اور اس کام کو دوسروں کے لیے نہیں چھوڑتا ہے۔ کئی زاویے سے دیکھا جائے تو اس پیشے میں کام ملنا کافی مشکل ہے اور مل گیا تو اسے برقرار رکھنا اور بھی مشکل ہے اور اس سے بھی مشکل ہے اچھی اسٹوری کا آئیڈیا پیش کرنا، اسے اچھی خبر میں تبدیل کرنا اور اسے ناظرین کے سامنے پیش کرنا۔ اس سلسلے میں یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ آپ سے پہلے کوئی اور چینل اسے پیش نہ کر دے۔ اسی میں آپ کی مہارت مضمر ہے۔

ٹیلی ویژن نیوز میں کام کرنا صرف ایک پیشہ ہی نہیں بلکہ طرز زندگی ہے۔ یہاں کے ملازمین کو چھٹیوں اور تہواروں کے دنوں میں بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ دفتر کے باہر بھی نگاہ اچھی اسٹوری کی تلاش میں رہتی ہے۔ مختلف چینلوں کی خبروں پر نگاہ رکھنا اور ساتھ ہی اپنے کام پر بھی تاکہ پتہ چل سکے کہ اپنا کام اور بہتر کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہ چیزیں ذہنی تناؤ میں مزید اضافہ کرتی ہیں اور یہ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ تاہم ٹیلی ویژن نیوز میں کام کرنے کا اپنا صلہ بھی ہے، ایک پر وقار اور پر جوش زندگی— سماج کے مختلف لوگوں سے ملنا اور ان کا انٹرویو کرنا۔ ان لوگوں سے ملاقات جو شاید دوسری صورت میں کبھی میسر نہ ہو پاتی۔ اس طرح کی ملاقاتوں سے اپنے فرقے اور برادری کے بڑے مسائل سے بھی روبرو ہونے کا موقع ملتا ہے۔ کام کو بہتر طریقے سے انجام دینے میں ایک جذباتی تسکین بھی حاصل ہوتی ہے۔

ٹیلی ویژن نیوز میں جس بنیادی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہے تحریر کی مہارت۔ تحریر دلچسپ اور واضح ہو۔ اس پیشے میں اچھی تحریر ایک بنیادی ہتھیار ہے جس کا اطلاق رپورٹر، پروڈیوسر، اینکر، ایڈیٹر، ویڈیو گرافر، ٹیپ ایڈیٹر اور دیگر سبھی کارکنوں پر جو اس عمل سے وابستہ ہیں، ہوتا ہے۔ جب تک وہ اچھی تحریر کی اہمیت کو نہ سمجھیں گے تب تک کوئی اچھا کام انجام نہیں دے سکتے۔ اچھی تحریر کا دارومدار اچھی رپورٹنگ پر ہوتا ہے۔ رپورٹر، رائٹر، پروڈیوسر یا ایڈیٹر کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اطلاعات کیسے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کن کن ذرائع سے رابطہ کیا جا سکتا ہے نیز اس موضوع پر کس طرح کا مواد آسانی سے فراہم ہوسکتا ہے۔ رپورٹنگ کی بنیادی مہارت کے لیے کسی استاد سے ایک دو لکچر یا ضروری مشورہ لینا کافی فائدے مند ہوسکتا ہے۔ یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ تحقیق کے ایک ضروری آلے یعنی انٹرنیٹ کا استعمال کیسے کیا جا سکتا ہے۔

رپورٹر اور اینکر کے لیے بہتر زبانی ادائیگی بھی ضروری ہے۔ زبانی ادائیگی سے مراد کسی مسودہ کو محض اچھی طرح پڑھ دینے سے نہیں بلکہ رپورٹر اور اینکر کو اس کا اہل ہونا چاہیے کہ ''تحریر کے ذریعے جن باتوں کو سامنے لانا چاہتے ہیں مہارت کے ساتھ پہلے ان کی زبانی ترسیل کریں۔ اس کے لیے اگر ممکن ہو تو بحث مباحثہ یا تھیٹر کی کارگزاریوں میں حصہ لیں۔ لفظوں کی ادائیگی اس طرح کرنا سیکھیں کہ ان کے معنی واضح ہو جائیں۔ ان کی ترسیل ناظرین تک بہ آسانی ہو جائے۔ ٹیلی ویژن صحافی کا علم وسیع ہونا ضروری ہے۔ اسے دنیا کے بارے میں پوری جانکاری ہونی چاہیے کہ کہاں کیا ہو رہا ہے تبھی وہ ایک اچھی اسٹوری کی شناخت کر پائے گا اور اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کن لوگوں سے کس طرح کے سوالات پوچھے جا سکتے ہیں اور کیسے ان کے جواب حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اسے ادب، سائنس، تجارت، تاریخ،

معاشیات وغیرہ کی بنیادی باتیں معلوم ہونی چاہئیں ایک کامیاب ٹیلی ویژن صحافی بننے کے لیے ان میں سے زیادہ تر کا استعمال معمول کے طور پر کرنا پڑے گا۔ ایسی معلومات بھی ضروری ہے جو اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی کلاسوں میں نہیں بلکہ سفر کے مشاہدوں، عام زندگی کے تجربوں اور لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے حاصل ہوگا یہ سبھی تجربات اور مشاہدات اس وقت کام آتے ہیں جب کوئی شخص اپنی صلاحیت کو اس پیشے میں بروئے کار لاتا ہے۔ ایسے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ہے جو ٹیلی ویژن نیوز میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے اخباروں کے مطالعے کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ٹی.وی. نیوز بلیٹن کو غور سے دیکھیں۔ اگر کسی شخص میں اپنے ارد گرد کے ماحول کے بارے میں جاننے کا تجسس نہیں تو یہ پیشہ اس کے لیے قطعی موزوں نہیں۔ ہر ماہ دو یا تین ایسے رسائل بھی پڑھنے چاہئیں جو خبروں سے متعلق ہوں۔ ٹیلی ویژن نیوز میں کام کے اچھے اور برے نمونے آسانی سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس لیے ٹیلی ویژن کی خبریں دیکھتے وقت ان باتوں پر خصوصی توجہ دینی چاہیے کہ جو باتیں ان خبروں میں کہی گئی ہیں وہ کیسے کہی گئی ہیں اور کیا کہی گئی ہیں، پیش کش کا کیا اسٹائل ہے اور کون اچھے رپورٹر، رائیٹر، ایڈیٹر اور کیمرہ مین ہیں۔ ان سب کاموں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ مختلف چیزوں کے بارے میں جاننے کے لیے آپ میں تجسس ہونا چاہیے۔ اس سے آپ کے سیکھنے اور انٹرویو کرنے کی مہارت میں اضافہ ہوگا۔ ٹائپنگ کا جاننا ایک بنیادی تکنیکی مہارت ہے اور کمپیوٹر پر ٹائپ کرنے کی معلومات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ کمپیوٹر کے بنیادی پروگرام، آن لائن وسائل اور نیٹ ورکنگ کے بارے میں بھی معلومات ضروری ہے۔ آڈیو اور ویڈیو ٹیکنالوجی کی بنیادی سمجھ بھی کافی اہم ہے اور یہ بھی کہ آوازوں اور تصویروں کو کیسے ریکارڈ کیا جاتا ہے اور کیسے ان سے ایک اچھی اسٹوری بنائی جا سکتی ہے۔ اب سبھی نیوز روم پوری طرح سے کمپیوٹرائزڈ ہو چکے ہیں جس سے رپورٹر، رائٹر، اور پروڈیوسر کو رن ڈاؤن چیک کرنے، اسکرپٹ لکھنے، ویڈیو کی نظر ثانی کرنے اور اسکرپٹ کو سینئر صحافی کی منظوری کے لیے بھیجنے یا پھر براہ راست ٹیلی پیرامیٹر تک بھیجنے میں آسانی ہوتی ہے۔ رپورٹر اور کیمرہ مین اب لیپ ٹاپ کمپیوٹر اور موبائل فون کے ساتھ اپنی اسٹوری کور کرنے کے لیے فیلڈ میں جاتے ہیں اور اپنے ساتھ ایسی گاڑی بھی لے جاتے ہیں جو جدید آلات سے مزین ہوتی ہے جن کی مدد سے وہ کسی بھی مقام سے اپنے اسٹوڈیو سے فوراً لائیو کنکٹ ہو سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن ٹیکنالوجی— آلات کا ایک سیٹ فراہم کرتی ہے جس سے ٹیلی ویژن صحافی کام کرتے ہیں۔ ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں بلکہ ان آلات کے بارے میں جاننے اور سیکھنے کا جذبہ ہونا چاہیے۔ نیوز روم میں کسی رول کو کیسے ادا کیا جاتا ہے اور کس طرح سے یہ سبھی رول بلیٹن اور چینل کی بقا کے لیے ضروری ہیں۔

ٹیلی ویژن میں کام کے دباؤ سے چھٹکارا ممکن نہیں اس لیے آپ کو اس کا عادی ہو جانا چاہیے۔ ٹیلی ویژن میں بہترین صحافی وہی ہے جو کسی طرح کے دباؤ کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتا اور اپنی توجہ اپنے کام پر مرکوز کیے رکھتا ہے۔ کیونکہ اس پیشے میں ڈیڈلائن کی بہت اہمیت ہے اور نیوز روم میں کام کر رہے پروفیشنل کا واسطہ بروقت ڈیڈلائن سے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کئی اسٹوریز پر ایک ساتھ کام کرنا ہوتا ہے اور ان سب کی ڈیڈ لائن بھی ایک ہوتی ہے۔ جب ڈیڈ لائن قریب آئے تو گھبرانا نہیں چاہیے— اپنے اعصاب پر قابو پانا سیکھیں۔ لوگوں کے ساتھ گھل مل کر کام کریں۔ بہت سے لوگوں میں چڑچڑاپن ہوتا ہے یا جلد ناراض ہونے کی عادت ہوتی ہے۔ آپ سوچتے ہیں اگر وہ اپنا کام ویسے ہی کریں جیسا کہ آپ چاہتے ہیں تو آپ کا کام کتنا آسان ہو جائے۔ ان باتوں کو سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ان کی ان خصلتوں کو جانتے ہوئے بھی آپ کو ان کے ساتھ کام کرنا ہے۔ اس لیے آپ ان سے بہتر تعلقات بنائیں، عزت سے پیش آئیں اور اپنے کام پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھیں۔ کام کرنے کے کچھ بنیادی اصول وضوابط تیار کریں اور جب بھی اور جہاں کہیں بھی آپ کے تعاون کی ضرورت پڑے اپنا بھرپور تعاون دیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ نیوز روم میں کسی سے بھی تعلقات خراب نہ کریں کیونکہ اس پیشے میں داخلہ ملنا مشکل ہے اور اس سے بھی مشکل ہے آگے بڑھنا۔ پیشے سے وابستہ اچھے صحافیوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں اور ان سے اپنے رشتے استوار کریں۔ اس پیشے میں ایک دوست یا ایسا شخص جسے آج آپ جانتے ہیں اور جس کے ساتھ آپ نے اچھا سلوک کیا ہے، ممکن ہے کہ کل وہی آپ کو بہتر روزگار کے مواقع فراہم کرنے میں آپ کی مدد کرے۔ جن لوگوں کی پوزیشن آج آپ کے برابر یا آپ سے کم ہے وہی لوگ دو سال بعد آپ کو ترقی دینے یا نوکری سے نکالنے میں اہم کردار نبھا سکتے ہیں۔

بنیادی بات یہ ہے کہ دوسروں کی عزت کے ساتھ آپ کو اپنی قابلیت کے بارے میں بھی پر اعتماد ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ بہت سی غلطیاں کریں اور انہی غلطیوں سے آپ کو سیکھنے کا موقع بھی ملے۔ کوشش کریں کہ

غلطیاں کم سے کم ہوں، لیکن غلطیوں کا ہونا فطری ہے کیونکہ یہ اس عمل کا حصہ ہے۔ جب آپ کوئی غلطی کرتے ہیں اور اس کے لیے آپ کو کسی کی ڈانٹ سننا پڑتی ہے یا کسی کی تنقید کا نشانہ بنتے ہیں تو بجائے اس پر اپنی ناراضگی دکھانے کے ان غلطیوں کو تسلیم کر لینا زیادہ بہتر ہوگا اور اس سے بھی بہتر ان غلطیوں سے سبق حاصل کرنا۔ اپنی صلاحیت پر یقین رکھیں اور جتنا بہتر کر سکتے ہیں کرنے کی کوشش کریں۔ صحت کا خیال رکھیں، سادہ کھانا کھائیں اور اپنی نیند پوری کریں اگر آپ شراب کے عادی ہیں تو کم سے کم مقدار میں شراب پینے کی کوشش کریں ورنہ آپ کے کام کرنے کی صلاحیت حد درجہ متاثر ہوگی۔ دن کے کھانے کو بھی کبھی نظر انداز نہ کریں۔

آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہر لمحہ آپ کسی نہ کسی نیوز اسٹوری پر کام کرتے رہیں۔ نیوز میکنگ کے پورے عمل میں غرق رہنے میں خوشی محسوس کریں اور اپنے کیریئر کو آگے بڑھانے کے دوران ہر شخص سے پیشہ ورانہ مقابلہ کریں۔ مقابلے سے مراد یہ ہے کہ آپ اتنی محنت کریں کہ اپنے کام میں ماہر ہو جائیں اور دوسروں کو آپ کی اہمیت کا احساس ہو۔ اپنے عمل میں، اپنی وضع قطع میں، اپنے رویے میں پروفیشنلزم اپنائیں۔ ٹیلی ویژن نیوز کثیر الجہات ہوتی ہیں۔ ٹیلی ویژن کی تکنیک لگاتار بدلتی رہتی ہے اور اسی لیے سیکھنے کا عمل لگاتار جاری رہتا ہے۔ دوسرا عمل جو لگاتار جاری رہتا ہے وہ ہے تحریر۔ اگر آپ کو زبان پر مکمل عبور حاصل ہے اور آپ ایک اچھے رائٹر ہیں تو ٹیلی ویژن نیوز میں آپ کا مستقبل تابناک ہے۔

□□□

پتہ:
11/43, Third Floor
Jogabai Extension
Zakir Nagar, New Delhi-110025.

مجموعۂ نغز

مصنف: قدرت اللہ قاسم

حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا یہ مشہور تذکرہ، دو جلدوں میں تھا جسے فاضل مرتب پروفیسر محمود شیرانی نے یکجا کر دیا ہے۔ پروفیسر شیرانی کا خیال ہے کہ محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آب حیات کا ایک اہم ماخذ یہ تذکرہ بھی ہے جس کا قلمی نسخہ انھیں آزاد کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوا۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 492، قیمت -/268 روپے

عربی ادب کی تاریخ (تین جلدوں میں)

مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

مدارس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اردو میں کوئی ایسی کتاب دستیاب نہیں تھی جس میں عربی ادب کی جامع اور مبسوط تاریخ بیان کی گئی ہو۔ ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ کتاب کی پہلی جلد میں زمانۂ جاہلیت، دوسری جلد میں حضرت محمدؐ کے عہد سے خلفائے راشدین کے عہد نیز اموی دور اور تیسری جلد میں عباسی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات: جلد اول: 352، جلد دوم: 390، جلد سوم: زیر طبع
قیمت: جلد اول: 86 روپے، جلد دوم: 91 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

الیاس انور

سماجی اور فلاحی کارکن

سماجی اور فلاحی کام سے مراد ہے لوگوں کو ان کی روز مرہ زندگی میں پیش آنے والی مشکلات کا سامنا کرنے میں ان کی مدد کرنا۔ ان مشکلات و مسائل کا تعلق کئی چیزوں سے ہو سکتا ہے جیسے ذہنی اور جسمانی معذوری، بڑھاپے میں درپیش مسائل، ذہنی ہم آہنگی کا فقدان، قانون کے ساتھ ٹکراؤ، بے روزگاری اور ناداری وغیرہ۔ چونکہ موجودہ طرز زندگی کی پیچیدگیوں کے نتیجے میں لوگوں کے سامنے طرح طرح کے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں، اس لیے سماجی اور فلاحی کام کرنے والوں کی ضرورت بھی زیادہ سے زیادہ محسوس کی جا رہی ہے۔ یہ کارکن مختلف اسباب جیسے بیماری، غریبی، معاشرے کے ساتھ ہم آہنگی کے فقدان، گھر یا دفتر وغیرہ میں بحران، سماج دشمن رویے، زندگی کی پابندیوں وغیرہ سے پیدا ہونے والے مسائل اور تکالیف کا رفع کرنے اور ان کی روک تھام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندوستان میں سماجی اور فلاحی کام ایک پیشے کے طور پر اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ روزمرہ کی زندگی کی پیچیدگیوں، مشترکہ خاندان کے بکھراؤ سے ظہور میں آنے والے شوہر، بیوی اور بچوں پر مشتمل محدود خاندانوں اور دیگر اثرات کی وجہ سے روز بروز نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ مختلف اقسام کے نفسیاتی دباؤ، جرائم اور جسمانی و ذہنی معذوریوں کے بڑھتے ہوئے دائرے کے سبب ایسے افراد کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے جو آگے آ کر ذہنی و جذباتی دباؤ اور مصائب و آلام سے لوگوں کو راحت دلانے کا کام کر سکیں۔

سماجی کام کے مطالعے کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ عمرانیات، نفسیات، انسانی نشو و نما اور ترقی، شادی بیاہ اور خاندان، معاشیات، تعلیم، حیاتیات اور جرائم وغیرہ جیسے مضامین اس کے دائرے میں آتے ہیں۔ چنانچہ سوشل ورک کا مطلب مذکورہ بالا مسائل کو حل کرنے کے لیے ان علوم کو بروئے کار لانا ہے۔ بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری ایجنسیاں سماجی اور فلاحی کارکنوں کی مدد لے رہی ہے۔

سوشل ورک عام طور پر تین سطحوں پر کیا جاتا ہے۔ پہلی انفرادی سطح جسے کیس ورک بھی کہا جاتا ہے، دوسری سطح یعنی گروپ ورک اور تیسری سطح یعنی ''کمیونٹی آرگنائزیشن ورک'' سوشل ورکر عام طور پر کسی ایجنسی کے ساتھ ان تینوں میں سے کسی ایک سطح پر کام کرتے ہیں۔ انفرادی سطح پر یا کسی کیس پر کام کرنے والے سوشل ورکر کسی فرد یا خاندان کے ساتھ براہ راست رابطہ قائم کرتے ہیں۔ دفتر یا گھر میں جا کر ملاقاتیں کرتے ہیں، اسپتال میں کام کرتے ہیں یا گھر پر، اسکول اور خصوصی اداروں میں بچوں کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اجتماعی سطح پر کام یا گروپ ورک میں عام طور پر خصوصی گروپوں کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے۔ جیسے معمر افراد، معذور افراد، سماجی و معاشی گروپوں کے لوگ، مزدور اور سماج دشمن رویہ رکھنے والے افراد وغیرہ۔ کمیونٹی ورک میں کسی پوری کمیونٹی یا فرقہ کو درپیش مسائل کا تجزیہ کرنے اور ان کے ممکنہ حل تلاش کرنے کا کام شامل ہے۔ اس میں کمیونٹی کی تعلیم یا پوری کمیونٹی کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش بھی شامل ہے۔ عام طور پر سوشل ورکر کو ان تینوں سطحوں پر کام کرنا پڑتا ہے۔ کام کی نوعیت کا تعین عموماً وہ ایجنسی یا تنظیم کرتی ہے جس کے ساتھ سوشل ورکر وابستہ ہوتا ہے۔

اسکولوں میں کام کرنے والے سوشل ورکر طلبہ، اساتذہ اور والدین کے ساتھ کام کرتے ہیں ان کا سب سے اہم کام اسکول اور گھر کے درمیان خلا کو پر کرنا ہوتا ہے جس سے بچے کو بہترین نتائج حاصل کرنے میں مدد مل سکے۔ یہ سوشل ورکر طلبہ کے مسائل کی نشاندہی کر کے انھیں حل کرنے میں طلبہ کی مدد کرتے ہیں۔ یہ بالخصوص طلبہ کے جذباتی رویوں سے متعلق مسائل حل کرنے میں مدد کرتے ہیں اور اس غرض سے بچوں کے والدین اور اساتذہ سے مل کر ان مسائل کی جڑ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اساتذہ اور والدین کو بھی مشورے دیتے ہیں جن سے انھیں طلبہ کی دلچسپیوں کو فروغ دینے اور ان کے کیریئر سے متعلق امکانات تلاش کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ابتدائی اسکولوں میں یہ سوشل ورکر اپنے مشوروں سے بیشتر ذاتی اور سماجی مسائل حل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

اسکول سوشل ورکر طلبہ کے لیے کمیونٹی پروگرام منعقد کرتے ہیں تاکہ ان میں ایک دوسرے کی مدد کرنے اور دیکھ بھال کرنے کی صلاحیت فروغ پا سکے۔

بعض اوقات سوشل ورکر سنجیدہ مسائل میں مبتلا بچوں اور والدین کو ان کے مسائل حل کرنے کے لیے دوسری ایجنسیوں کے پاس بھی بھیجتے ہیں۔

میڈیکل سوشل ورکر شدید، پرانی اور لاعلاج بیماریوں میں مبتلا مریضوں اور ان کے گھر والوں کو حالات کا سامنا کرنے اور مریضوں کی صحت یابی یا بحالی کی راہ میں حائل دشواریوں کو دور کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ وہ کینسر، ایڈز، ٹی. بی. اور کوڑھ جیسی بیماریوں میں مبتلا مریضوں کے کنبوں کے لیے مددگار گروپ بھی تیار کرتے ہیں۔ صحت یاب ہونے والے مریضوں اور طویل بیماریوں میں مبتلا مریضوں کو صلاح ومشورے اور ہدایات دینا بھی ان کے کام میں شامل ہے۔

میڈیکل سوشل ورکر بالخصوص کینسر اسپتالوں اور دیگر اسپتالوں کے متعلقہ شعبوں میں کام کرتے ہیں جہاں شدید بیماریوں میں مبتلا مریض زیر علاج ہوتے ہیں۔ مغربی ممالک میں تو بیشتر اسپتالوں میں سوشل ورکر رکھے جاتے ہیں تاہم ہندوستان میں عام طور سے ایسا نہیں ہوتا۔ جب کوئی شخص مستقل طور پر کسی معذوری کا شکار ہوتا ہے یا اپنی مرضی کے مطابق ایک نارمل انسان کی طرح چلنے پھرنے اور کام کرنے سے معذور ہوتا ہے تو اس صورت حال کا سامنا کرنے میں اسے بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ میڈیکل سوشل ورکر حالات کا مقابلہ کرنے میں ان لوگوں کی مع اہل خانہ مدد کرتے ہیں۔

نفسیاتی امراض کے میدان میں کام کرنے والے سوشل ورکر کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ سوشل ورکر جو بچوں کی رہنمائی کرنے والے اسپتالوں میں کام کرتے ہیں اور دوئم وہ سوشل ورکر جو نفسیاتی امراض کے شعبوں یا اسپتالوں میں کام کرتے ہیں۔ چائلڈ گائڈینس کلینک میں سوشل ورکر، نفسیاتی امراض کے ڈاکٹروں اور طبی ماہرین نفسیات کی ٹیم ذہنی پریشانیوں کے شکار بچوں اور نوجوانوں کے لیے کام کرتی ہے۔ ان میں سے بیشتر مریض ڈاکٹروں کے ذریعے بہ غرض علاج بھیجے جاتے ہیں اور ان میں عام طور پر وہ بچے اور نوجوان شامل ہوتے ہیں جن کا رویہ ناپسندیدہ ہوتا ہے یا جن میں سماج سے ہم آہنگی کا فقدان ہوتا ہے، یا جو کسی خوف کا شکار ہوتے ہیں یا سماج سے الگ تھلگ ہو جاتے ہیں یا ایسے بچے جنھیں سیکھنے میں مشکلات درپیش آتی ہیں جن کے سبب وہ یا تو پڑھائی میں پچھڑنے لگتے ہیں یا اسکول سے بھاگنے لگتے ہیں۔ سوشل ورکر ایسے بچوں یا نوجوانوں کے کنبے کے ساتھ گھل مل کر اس مسئلے کے اسباب کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس کے حل میں مدد مل سکے۔ بعض معاملات میں سوشل ورکر اساتذہ اور تعلیمی نفسیات کے ماہرین سے بھی رجوع کرتے ہیں۔

نفسیاتی امراض کے اسپتالوں میں سوشل ورکر مختلف قسم کے مریضوں کے گروپ سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ ان مریضوں میں عمر رسیدہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو بڑھاپے میں پیدا ہو جانے والے ذہنی اور دماغی خلل یا افسردگی کا شکار ہوتے ہیں یا نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ سوشل ورکر مریضوں کی کیس شیٹ لکھتے ہیں اور اس دوران نئے مریضوں کو جانچنے، ان کے مرض کی تشخیص کرنے اور ان امراض کے اسباب تلاش کرنے میں نفسیاتی معالج کی مدد کرتے ہیں اور مریضوں کے علاج کے دوران ان کی صحت یابی میں مدد کرتے ہیں۔

کمیونٹی سوشل ورکر ایسے لوگوں کے ساتھ کام کرنے میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں جنھیں اجتماعی طور پر کسی مسئلے کا سامنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ان میں ایسے گروپ آتے ہیں جن کے پاس مناسب رہائش نہیں ہے یا جو بے روزگاری کا شکار ہیں یا مقامی سہولیات سے محروم ہیں یا جو کسی فرقے میں اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مشکلات سے دوچار ہیں۔

کمیونٹی سوشل ورکر ایسے لوگوں کو درپیش حالات میں بہتری لانے کے لیے کام شروع کرتے ہیں یا اس کام میں دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مدد کے لیے وہ اپنی معلومات، پیشہ ورانہ روابط اور وسائل سے کام لیتے ہیں۔ سوشل ورکر بعض اوقات سماجی پالیسی پر اثر انداز ہونے اور سہولیات اور مراعات سے محروم لوگوں کے لیے وسائل فراہم کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ کمیونٹی سوشل ورکر شہری اور دیہی علاقوں میں اور قومی یا بین الاقوامی تنظیموں کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔

ہر ملک میں جیل خانے، اصلاح خانے، ریمانڈ روم ہوتے ہیں اور جرائم اور قانون شکنی کو روکنے کے لیے پروگرام چلائے جاتے ہیں۔ سوشل ورکر کو ان میدانوں میں بھی کام کرنے کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ سماج دشمن کے رویے کے سد باب کے لیے مثبت سماجی فضا ہموار کر سکے۔ جرم و انصاف کے میدان میں کام کرنے والے سوشل ورکر عدالتوں کو اپنی سفارشیں پیش کرتے ہیں اور قیدیوں اور ان کے کنبے والوں کے لیے اپنی خدمات فراہم کرتے ہیں۔ وہ پیرول یا مشروط رہائی پائے ہوئے افراد کے لیے بھی اسی قسم کی خدمات فراہم کرتے ہیں۔

ان دنوں سوشل ورکر صنعتی اور تجارتی اداروں کے عملے سے متعلق شعبوں کا لازمی جزو بن گئے ہیں۔ نجی اور سرکاری زمروں میں صحت مند صنعتی ماحول قائم

رکھنے کے لیے ملازمین کی فلاح و بہبود پر خاصی توجہ دی جا رہی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سوشل ورکر عملے کے منتظمین کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ وہ مختلف پروگراموں کے تحت ملازمین اور مزدوروں کو ان کے کام سے متعلق مسائل کو حل کرنے اور ذہنی تناؤ کو کم کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ وہ تعلیمی اور تربیتی پروگرام بھی بناتے ہیں اور مزدوروں کو خصوصی کیمونٹی پروگراموں میں حصہ لینے کے لیے بھی بھیجتے ہیں۔

سوشل ورکر عوامی بہبود کی ایجنسیوں، سماجی خدمات کی نجی تنظیموں، بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں، اسپتالوں، اسکولوں اور بحالی کے مراکز میں کام کرتے ہیں۔ سوشل ورک (MSW) میں ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد صنعتوں یا کمپنیوں میں عملے کے نگراں افسر یا مزدوروں کی بہبود کے افسر کی حیثیت سے ملازمت مل سکتی ہے۔ کچھ طبی سوشل ورکر بالخصوص نفسیاتی علاج کے صلاح کار کی حیثیت سے نجی پریکٹس کرنا پسند کرتے ہیں۔

سوشل ورک میں ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد تقریباً 90 فیصد امیدواروں کو معقول ملازمت مل جاتی ہے۔ وہ سرکاری اداروں، جیل خانوں، اسپتالوں اور فلاحی کام کرنے والی ایجنسیوں اور رضا کار تنظیموں میں کام کرتے ہیں۔ خصوصی مہارت کے شعبوں میں بھی ملازمت کے مواقع موجود ہیں۔ جو طلبہ علم جرائم اور اصلاحی کاموں میں خصوصی مہارت حاصل کر لیتے ہیں انھیں جیل خانوں اور ان سرکاری محکموں میں ملازمت مل جاتی ہے جن کے ذمے اصلاح کا کام ہوتا ہے۔ طبی اور نفسیاتی سماجی کام میں خصوصی مہارت کے حامل امیدوار شفا خانوں، اسپتالوں، مرکز صحت، بچوں کی رہنمائی کے مطبوں، صلاح کاری کے مراکز، دماغی اسپتالوں، طبی کالجوں اور عوامی صحت کے مراکز وغیرہ میں ملازمت حاصل کر سکتے ہیں۔ کیمونٹی کی ترقی میں خصوصی مہارت رکھنے والے سوشل ورکر کیمونٹی گروپوں، سرکاری اور رضا کار تنظیموں اور کیمونٹی کے مقامی رہنماؤں کے ساتھ فیلڈ ورک کرتے ہیں جس کا مقصد منصوبہ بند تبدیلی کے ذریعے کسی مخصوص کیمونٹی کی فلاحی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ موجودہ زندگی کے بڑھتے ہوئے تناؤ، دباؤ اور ذہنی اعتبار سے پسماندہ اور معمر افراد کی دیکھ بھال کی جانب بڑھتی ہوئی توجہ کی بدولت سوشل ورکر کی زیادہ سے زیادہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد ایسی جسمانی معذوریوں اور نقائص کی شکار ہے کہ ان کے لیے بغیر کسی سہارے یا مدد کے گھر میں رہنا دشوار ہوتا ہے۔ دولت کی فراوانی کے سبب لوگ اپنے ذاتی مسائل میں پیشہ ورانہ مدد حاصل کرنے کے لیے پیسہ دینے کو تیار ہیں۔

چونکہ سوشل ورکر کی مانگ ان کی دستیابی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے اس لیے ان کی تنخواہیں بھی بڑھ رہی ہیں لیکن تعلیمی لیاقت کی سطح پر تجربے اور کام کی نوعیت کے مطابق تنخواہوں میں فرق ہوتا ہے۔

اس میدان میں کامیاب ہونے کے لیے جن صلاحیتوں اور ذاتی خصوصیات کی ضرورت ہے ان میں جذباتی ٹھہراؤ، صبر کا مادہ، عزم و ارادہ اور سب سے زیادہ دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے سچی لگن شامل ہیں۔ سوشل ورکر میں مختلف پس منظروں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ساتھ کام کرنے اور انسانی ذہن کو سمجھنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔ کسی غیر ملکی زبان کی واقفیت اس میدان میں بہتر ملازمت حاصل کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

بیشتر ملازمتوں کے لیے کم از کم تعلیمی لیاقت بی۔ اے۔ کی ڈگری ہے۔ سوشل ورک (BSW) میں بی۔ اے۔ کی ڈگری کے علاوہ نفسیات، سماجیات اور متعلقہ مضامین میں انٹر گریجویٹ کورس کرنے والے امیدوار بھی بعض ایجنسیوں، بالخصوص چھوٹی کیمونٹی ایجنسیوں میں ملازمت کی شرائط پوری کرتے ہیں۔ سوشل ورک (MSW) میں ایم۔ اے۔ کرنے کے لیے عام طور سے بی۔ ایس۔ ڈبلیو۔ ہونا ضروری نہیں ہے۔ معاشیات، نفسیات، حیاتیات، سماجیات، سیاسیات اور تاریخ میں بی۔ اے۔ کی ڈگری رکھنے والے امیدوار بھی ایم۔ ایس۔ ڈبلیو۔ میں داخلہ لے سکتے ہیں۔

اس میدان میں تعلیم دینے والا ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز، دیونار پوسٹ آفس 8313، سائن ٹرامبے روڈ، ممبئی۔ 400088، ایک سرکردہ ادارہ ہے۔ یہاں سے سوشل ورک میں ایم۔ اے۔ کیا جا سکتا ہے جس کے ساتھ علم جرائم اور اصلاحی انتظامیہ، کنبے اور بچوں کی فلاح و بہبود، طبی اور نفسیاتی سماجی کام اور شہری اور دیہی کیمونٹی ڈیولپمنٹ میں خصوصی مہارت حاصل کی جا سکتی ہے۔ دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی یونیورسٹی سے بھی سوشل ورک میں بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے۔ کیا جا سکتا ہے۔

□□□

پتہ:
Chabki, P.O. Laxmi Sagar
Distt. Darbhanga-846009
(Bihar)

سید جعفر محمود

ہماری مطبوعات سے

دیہی تکنالوجی اور ماحولیاتی انتظام وانصرام

'دیہی تکنالوجی' لازماً اس وجہ سے ممیز ہے کہ اس میں جبلی طور پر منفعت بخش روزگار پیدا کرنے، پیداوار میں اضافہ کرنے، فصلوں اور ضمنی پیداوار کے ادوار کو دہرانے اور اضافی قدر و قیمت کی اشیا تیار کرنے کی صلاحیتیں موجود ہیں اور اس طرح یہ تخلیقی کام میں اضافہ اور دیہی ماحول میں آمدنی کو دلکش بنا دیتی ہے۔ بہتر رہائش گاہ اور صفائی ستھرائی، اجتماعی خدمات، خصوصاً عورتوں کو رات دن کام میں جتے رہنے سے نجات تکنیکی، معاشی نظامات کے فروغ کے ذریعے انسانی بہبود اور انسانی ترقی کے دیگر پہلوؤں کو حسب ضرورت سامان بہم پہنچانے جیسی باتیں عام طور پر 'دیہی تکنالوجی' کہی جانے والی جماعت کی تکنیکوں کے تحت ہی آتی ہیں۔

دی نیشنل ریسرچ ڈیولپمنٹ کارپوریشن، کاؤنسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ، انڈین کاؤنسل آف ایگریکلچر ریسرچ یا ڈپارٹمنٹ آف سائنس اینڈ تکنالوجی یا کھادی ویلج انڈسٹریز کارپوریشن یا ڈپارٹمنٹ آف رورل ری کنسٹرکشن نے مل کر غذا، پانی، صفائی ستھرائی، ماحول، انسانی بستی، سڑکیں اور پیغام رسانی، توانائی اور قدرتی وسائل کو فروغ دینے اور ان میدانوں میں نئی تکنیکوں کا عملی مظاہرہ کرنے کا کافی کام انجام دیا ہے۔ مثلاً صنعت چرم (Leather Industry)، برتن سازی، دالوں اور اجناس کو محفوظ کرنا، ماچس بنانا، آتش بازی، صابن سازی، ہاتھ کا بنایا ہوا کاغذ، شہد کی مکھیاں پالنا، بان اور دیگر ریشے تیار کرنے کی صنعت، بایو گیس، چونا تیار کرنا، لوہار کا کام اور بڑھئی کا کام وغیرہ۔

پانی صاف کرنے کا روایتی طریقہ جس میں پانی کو ریت، کنکروں اور لکڑی کے کوئلے کے برتنوں میں سے گزارا جاتا ہے جس سے اس میں معلق گندگیاں صاف ہو جاتی ہیں اور پھر جراثیم مارنے کے لیے اسے ابالا جاتا ہے۔ اس طریقہ کو 'ریجنل ریسرچ لیبوریٹریز' نے بہت سادہ اور آسان بنا دیا ہے۔

ہندوستانی سائنس دانوں نے بڑے پیمانہ پر پینے کے پانی سے متعلق تکنیکوں کے ضمن میں کم خرچ مگر مساوی طور پر متبادل حل تلاش کیے ہیں۔ انھوں نے ایسی بہت سی تکنیکیں فروغ دی ہیں کہ جنھیں استعمال کرکے پانی پینے کے لیے نہ صرف یہ کہ برتنوں میں بھر کر رکھا جا سکتا ہے بلکہ اسے بیماریوں کے جراثیم جیسے بیکٹیریا، وائرس، پروٹوزوا اور مختلف قسم کے کیڑوں سے پاک بھی کیا جا سکتا ہے جب کہ یہ طبعی طور پر صاف و شفاف اور ذائقے میں بھی قابل قبول ہوتا ہے۔

دی نیشنل اینوائرن مینٹل انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ناگپور نے گیارہ ریاستوں میں منتخب دیہی پانی کی فراہمی کی اسکیموں کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور دیہی واٹر سپلائی کے ضمن میں پروجیکٹ تجاویز تیار کی ہیں جن میں ان پروجیکٹوں کی منصوبہ بندی، ڈیزائن کاری، تعمیر، کام کاج اور رکھ رکھاؤ جیسی باتیں شامل ہیں۔

جن دیہی علاقوں میں زمین سے نکلنے والا پانی کوالٹی کا ہے اور مناسب گہرائی پر ہے وہاں یہ پانی ہینڈ پمپ اور مختلف ڈیزائن کے ٹیوب ویلوں سے نکالا جاتا ہے کیونکہ یہ پانی قدرتی طور پر چھنا ہوا ہوتا ہے اس لیے حفظان صحت کے مدنظر اس میں سوائے کلورین ملانے کے اور کچھ نہیں کیا جاتا۔ دیہی حالات میں استعمال کیا جانے والا ایک چھوٹا سا ''واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ'' NEERI نے ڈیزائن کرکے فروغ دیا ہے۔ اس پلانٹ کے تین اہم مرکز اسطوانی (cylndrical) خانے ہوتے ہیں، سب سے اندرونی ''فلوکولیٹر'' (flocculator) میں پیڈلس (Paddles) موجود ہوتے ہیں۔ چکری کا ماحول ایک آلہ کے ذریعے جسے کونسٹنٹ ہیڈ گریوٹی کہتے ہیں، اس پلانٹ میں داخل ہوتا رہتا ہے۔ یہ فلوکولیٹ شدہ اور بیٹھے ہوئے پانی کو چھان لیا جاتا ہے۔ سیڈی مینٹیشن حوض میں بہہ کر آنے سے قبل فلوکولیٹ شدہ پانی میں بلیچنگ پاؤڈر کا محلول ملایا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں جراثیم سے مبرا کرنے کے لیے کافی تمام وقت (contnact time) مل جاتا ہے اور سیڈی مینٹیشن حوض اور فلٹر کا علاقہ کسی بھی قسم کی نامیاتی غلاظت سے مبرا ہیں۔

''آزادی کے بعد سے سائنس، تکنالوجی اور ترقی'' سے ماخوذ　　صفحات: 487　　قیمت: -/123روپئے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔　　ادارہ

SERC نے جو پانی کی ٹنکیاں تیار کی ہیں وہ گول شکل والی ہوتی ہیں اور انھیں پہلے سے ہی تیار شدہ حصول کو جوڑ کر تعمیر کیا جاتا ہے، اس ادارہ میں فروغ شدہ ڈھلائی کے دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کو بروئے کار لا کر ان ٹنکیوں کی دیواریں تیار کی جاتی ہیں۔ یہ طریقے ایسے ہیں: گول (اسطوانی) اکائیوں کو بنانے کا نیم میکانی (semi mechanised) طریقہ قطعاتی خول کے حصول کو ڈھالنے اور پھر انھیں جوڑ کر گول (اسطوانی) اکائیوں میں تعمیر کر لینے کا طریقہ۔ پہلا طریقہ 2500 لیٹر گنجائش کی ٹنکیاں بنانے اور دوسرا طریقہ ایسی ٹنکیاں بنانے کے لیے موزوں رہتا ہے جنھیں پہاڑی علاقوں دیہاتوں میں استعمال کیا جاتا ہوتا ہے، جہاں نقل و حمل بہت مشکل ہیں اور یہی طریقہ 2500 لٹیر سے بڑی ٹنکیوں کو تعمیر کرنے میں بھی بروئے کار لایا جاتا ہے۔ NEERI نے جو چار کول واٹر فلٹر تیار کیا ہے وہ ٹھوس، معلق مادوں اور دیگر نقصان دہ جراثیم کو الگ کرنے کی ایک کارگر تکنیک ہے اس کے ذریعے ایک خاندان کے لیے پینے کا کافی پانی چھانا جا سکتا ہے۔

دی سینٹرل گلاس اینڈ سیرامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ یا CGCRI کلکتہ نے پانی چھاننے والی کینڈل (موم بتی نما اشکال، مگر موم بتی نہیں) تیار کی ہیں جنھیں گھریلو پانی کے برتنوں اور حتیٰ کہ مٹی کے گھڑوں میں بھی فٹ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کینڈل کچے پانی سے نقصان دہ جراثیم علاحدہ کر دیتی ہیں۔ دی ریجنل ریسرچ لیبوریٹری یا RRL جورہاٹ نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جسے بروئے کار لا کر گھریلو طور پر استعمال ہونے والی پانی چھاننے کی کینڈلوں کو بڑے پیمانہ پر تیار کیا جا سکتا ہے۔ ان کینڈلوں کو پانی کے گھریلو برتنوں اور مٹی کے گھڑوں تک میں بھی فٹ کیا جا سکتا ہے اور پلاسٹک کی بالٹیوں میں بھی، مناسب گریڈ والی چکنی مٹی (Clay) بائنڈر کلے (binder clay) اور مانع جراثیم (bacteria hibitor) الگ الگ پیسا اور پھر چھلنی میں سے گزارا جاتا ہے۔ پھر ان اجزا کو ایک دوسرے میں ملا کر مرکب تیار کیا جاتا ہے اور پھر ان میں سے آبی محلول ملا کر ان سے پتلا گارا بنایا جاتا ہے، پھر اس گارے کو سانچوں میں بھر کر اس سے کینڈلیں تیار کی جاتی ہیں، پھر انھیں سکھا کر پکا لیا جاتا ہے۔ اس تکنیک کا لائسنس 16 پارٹیوں کو دیا گیا ہے اور کچھ پارٹیاں اسے بڑے پیمانے پر تیار بھی کرنے لگی ہیں۔

گھریلو سطح پر خصوصاً دیہی علاقوں میں، پانی کو جراثیم سے مبرا کرنے کے لیے NEERI نے کلورین کی گولیاں اور ایمپیول (am pules) بھی تیار کیے ہیں۔ چند ریاستی حکومتوں کے محکمہ ہائے صحت ان گولیوں کو جمع کر کے دیہی اور ایسے علاقوں میں مفت تقسیم کرتے ہیں جہاں وبائی امراض پھیلنے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔

پینے کے پانی کو فلورین سے مبرا کرنے کے لیے NEERI، ناگپور اور تامل ناڈو واٹر سپلائی اینڈ ڈرینج بورڈ مدراس نے الگ الگ دو طریقے دریافت کیے ہیں، نالگونڈا تکنیک کے تحت ایک القلی (چونا، سوڈا ایش یا سوڈیم بائی کاربونیٹ)، پھٹکری اور بلیچنگ پاؤڈر کا آمیزہ برتنوں میں رکھے ہوئے پانی میں ملایا جاتا ہے۔ برتن کی تلی سے 3.5 سم اونچائی پر ایک ٹونٹی نصب رہتی ہے۔ جس کچے پانی کو پینے کے لیے استعمال کرنا ہوتا ہے اسے برتن میں بھر کر اس میں مناسب مقدار میں متذکرہ بالا کیمیاوی مرکبات ملا دیے جاتے ہیں۔ اس پانی کو تقریب دس منٹ تک ابالا جاتا ہے۔ اس طرح جو گالا (floc) پانی میں بن جاتا ہے وہ تقریباً ایک گھنٹہ میں تلی میں بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح بالائی شفاف پانی کو ٹونٹی کے ذریعے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ تلچھٹ کو پھینک دیا جاتا ہے۔ آندھرا پردیش، تامل ناڈو اور راجستھان کے چند دیہاتوں میں اس تکنیک کا عملی مظاہرہ کیا گیا ہے۔

50 لیٹر کچے پانی کے ساتھ اس کیمیاوی طریقے سے برتاؤ کرنے میں 2 سے 10 پیسے خرچ آتا ہے۔ خرچ کی کمی بیشی کا تعلق پانی میں فلورائڈ کے ارتکاز سے ہے۔ TWAD مدارس نے جو TWAD تکنیک فروغ دی ہے اسے بروئے کار لا کر پانی سے مکمل طور پر فلورائڈ دور کیا جاتا ہے۔ اس کے پلانٹ کی ڈیزائن کاری اس طرح کی گئی ہے کہ کنوؤں سے نکلنے والے کچے پانی کو پائپ سے گزارا جاتا ہے اور پانی کی سطح سے اوپر موجود مختلف اسٹیجوں پر اس پانی میں چونا اور پھٹکری ملائی جاتی ہے۔ جب پانی میں یہ کیمیاوی مرکبات مل جاتے ہیں تو یہ پانی ایک دوسرے پائپ سے ہو کر ایک ایسی گول ٹنکی میں نیچے سے داخل ہوتا ہے جس کی پینیدی مخروطی ہوتی ہے اور اس مخروطی حصہ میں دریائی کنکر بھرے رہتے ہیں، اس طرح عمل شدہ (treated) پانی کو ٹونٹی کے ذریعے اس ٹنکی کے اوپری حصہ سے باہر نکال لیا جاتا ہے۔

اس تکنالوجی کی ایک اہم بات یہ ہے کہ چونا اور پھٹکری کے پانی سے بین عملی (interaction) کی وجہ سے جو گالے بنتے ہیں وہ یکساں پرت کی شکل میں اوپر تیرتے پھرنے کے بجائے کنکریوں کے اوپر بیٹھ جاتے ہیں، اس طرح گاڑھی کیچڑ سے جو دبیز چادر (sludge blanket) تشکیل پاتی ہے وہ فلورائڈ کو الگ کرنے کے مناسب حالات پیدا کر دیتی ہے۔ TWAD تکنالوجی پھٹکری سے حاصل ہونے والے الومنیم کا رسوب بنانے میں بھی کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ اس طرح اس تکنیک سے جہاں کارگر طریقے سے فلورائڈ الگ کیا جا سکتا ہے وہیں اس کے ذریعے آخر میں الومنیم بھی الگ ہو جاتا ہے ورنہ اگر یہ الومنیم پانی میں جائز حد سے زیادہ موجود ہو تو یہ بھی صحت کے لیے ایک (اور) خطرہ بن جائے۔ TWAD کے سائنس دانوں نے مدراس کے پونامالی کے قریب ایک ابتدائی پلانٹ نصب کیا ہے جہاں ان لوگوں کو صد فی صد کامیابی ملی ہے۔

دی سینٹرل سالٹ اینڈ میرین کیمیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ یا CSMCRI بھاؤنگر اور بھابھا اٹامک ریسرچ سینٹر، بمبئی کے ذریعے کھارے پانی سے نمک علاحدہ کرکے اسے پینے کے قابل بنا کر رکھنے کی کئی تکنیکیں فروغ دی جا چکی ہیں۔ ہمارے ملک میں کھاراپن دور کرنے کے لیے زیادہ تر جو تکنیکیں اختیار کی جا رہی ہیں وہ ہیں پانی کشید کرنے کے طریقے، جھلی یا پردہ کا استعمال، الیکٹروڈائی لیسس اور شمسی کشیدگی کی تکنیکیں۔ CSMCRI، نیشنل فزیکل لیبوریٹری، نئی دہلی اور ڈفینس ریسرچ لیبوریٹری، جودھپور میں شمسی توانائی سے کشید آب پر کام کیا جا چکا ہے۔ کچھ میں CSMCRI نے ایک 1000 لیٹر روزانہ گنجائش کی تعمیر کی ہے۔

واٹر سپلائی کو جراثیم سے مبرّا کرنے کے لیے اس میں بلیچنگ پاؤڈر، آبی محلول یا گیس کی شکل میں کلورین ملائی جاتی ہے۔ باقی ماندہ کلورین کی مقدار کا پتہ لگانے کے لیے NEERI نے ایک کٹ (kit) تیار کی ہے، بہت زیادہ عامل (active) ہونے کے سبب یہ پانی میں موجود بہت سی ملاوٹوں حتیٰ کہ بیماری پیدا کرنے والے خورد نامیاتی اجسام (micro organisms) سے بھی تعامل کر جاتی ہے۔ پانی میں باقی ماندہ کلورین اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ پانی کے لیے کلورین کی طلب پوری ہو چکی ہے اور یہ اضافی کلورین بعد میں کسی اور انسانی آلودگی اور چھوت کی بیماری کا سبب بن سکتی ہے اور اسی لیے اس کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کٹ سے پانی میں سے مکمل طور پر جراثیم کا صفایا کرنے کے لیے مطلوبہ کلورین کی مناسب ترین سطح یعنی 0.2p.m.m. برقرار رکھنے کو یقینی بنانے میں مدد ملتی ہے۔

ہندوستان میں گھروں میں اور گھروں سے باہر استعمال کیے جانے والی ذخیرہ کرنے کی کئی قسم کی ٹنکیاں تیار کی گئی ہیں۔ یہ ٹنکیاں کئی ادارے تیار کرکے انھیں ٹیسٹ کر رہے ہیں۔ ان اداروں میں سینٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ یا CBRI روڑکی، اسٹرکچرل انجینئرنگ ریسرچ سینٹر یا SERC، غازی آباد، انڈین پلائی ووڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بنگلور اور انڈین گرین اسٹوریج انسٹی ٹیوٹ ہاپوڑ (یو. پی.) بھی شامل ہیں۔ یہ ٹنکیاں یا برتن گارے، بانس، پکی مٹی، پکی چنائی والے، دھات اور لکڑی سے انفرادی اور اجتماعی طریقے سے تیار کیے جا سکتے ہیں۔

CFTRI میسور نے گھن پر قابو پانے کے مندرجہ ذیل طریقے فروغ دیے ہیں:

تجارتی غذائی اجناس کے ذخیرہ کو بچانے یا محفوظ رکھنے کا ڈیورو فیوم (durofume) کا طریقہ۔

2. ایک ہلکی اور آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جانے والی مشین سے ان جوٹ کی بوریوں کو گھن روک (Pest proof) بنانا (400 بوریاں فی گھنٹہ کے حساب سے) جن میں خوردنی غلہ کا ذخیرہ کیا جاتا ہے۔
3. بخورات پیدا کرنے والی سستی گولیاں جنھیں منی فیوم کہا جاتا ہے (ایک گولی کی قیمت تقریباً 0.60 روپئے ہوتی ہے اور یہ گولی 100 کلوگرام خوردنی اجناس پر عمل کرنے (to treat) کے لیے کافی رہتی ہے۔
4. گھریلو چوہوں کو ختم کرنے کے لیے ایک متحدہ تکنیک جس میں چوہوں کے بلوں میں دھونی دینے، اور چوہوں کو دفع و راغب کرنے والی ادویہ اور زہریلا کھانا استعمال کیا جاتا ہے۔

RRL، بھوبنیشور نے کھانا محفوظ رکھنے والا فلاسک تیار کیا ہے جس میں رکھا ہوا کھانا تین دن تک محفوظ رہتا ہے اور اسے ریفریجریٹر میں رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

دیہی علاقوں میں سڑکیں تعمیر کرنے والے انجینئروں نے دیہی علاقوں میں سڑکیں تعمیر کرنے کی مختلف تکنیکوں کو بتدریج بہتر اور معیاری بنایا ہے اور وہ لوگ انھیں مختلف قسم کے میدانی حالات میں استعمال بھی کر رہے ہیں۔ سینٹرل روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، (The Central Road Research Institute) یا CRRI، نئی دہلی کے انجینئروں نے زمین کو مستحکم بنانے کی کم از کم چھ عدد سستی اور کارگر ترکیبوں کو معیاری بنایا ہے اس کے علاوہ ان لوگوں نے کئی ایسے اوزاروں کی ڈیزائن کاری کرکے انھیں تیار بھی کیا ہے، جو سہل بھی ہیں اور توانائی کی بچت کرنے والے بھی۔

دیہی سڑک تعمیر کرنے سے قبل اس زمین کو مستحکم بنانے کے لیے کچھ عمل کرنے ہوتے ہیں جس پر یہ سڑک بچھائی جاتی ہے۔ اس عمل کے بعد سڑک پر نہ تو گڑھے پڑتے ہیں اور نہ وہ ٹوٹتی پھوٹتی ہے۔ اگر زمین غیر مستحکم ہو تو اس پر بنی ہوئی سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹ بھی سکتی ہے اور پھر بظاہر اس پر گاڑیوں کا چلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ CRRI کے انجینئروں نے زمین مستحکم بنانے کی چھ تکنیکوں کو معیاری بنایا ہے، یہ تکنیکیں ہیں میکینیکل لائم سیمنٹ، لائم فلش، بائیٹومین اور دو سطحی استحکام۔

یہ تکنیکیں زمینی حالات اور کسی علاقے میں حاصل ہونے والے سامان کے پیش نظر بدلتی رہتی ہیں کیونکہ دیہی سڑکوں کی تعمیر میں سب سے بڑی رکاوٹ اس پر آنے والی لاگت ہی ہوتی ہے۔ جس زمین میں ریت، مورم غیر موجود کسروں کے ہمراہ کنکر پتھر ہوتے ہیں اور جو زیادہ چکنی ہوتی ہے اسے مستحکم

بنانے کے لیے میکانکی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ چونے کے ذریعے استحکام پیدا کرنے کو سب سے زیادہ فوقیت دی جاتی ہے کیونکہ ایک تو یہ نہایت آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے دوم یہ کہ سستا ہوتا ہے۔ کپاس کی کالی والی زمین چاہے، وہ مہاراشٹر میں ہو یا آندھرا پردیش و مدھیہ پردیش اور اتر پردیش میں، بہر حال سڑک بنانے کے کام میں مسائل پیدا کرتی ہے کیونکہ خشک موسم میں یہ زمین سوکھ کر چیخ جاتی ہے، یہ سڑک کی سطح کو بھی چٹخا کر رکھ دے گی البتہ اگر اس زمین میں صرف پانچ فیصد چونا بھی ملا دیا جائے تو ایک ایسا کیمیاوی تعامل واقع ہوتا ہے کہ پھر یہ زمین سڑک تعمیر کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے، ان ریاستوں میں سڑک بنانے اور زمین کو مستحکم کرنے کے لیے CRRI کے انجینئر یہی ترکیب استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ترکیب سستی بھی ہے اور دیرپا بھی۔ اس مقصد کے لیے زمین میں موجود مٹی نما معدنیات سے تعامل کرانے کے ذریعے چونے کو تابیدہ (dehydrated) کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے کیٹائنک مبادلہ، فلوکولیشن اور ایگلومریشن کے ذریعے زمین کی Plasticity میں تخفیف ہو جاتی ہے سیمنٹ جیسی سختی عطا کرنے والے مرکبات پیدا کرنے کے لیے مٹی نما معدنیات کے ساتھ طویل مدتی کیمیاوی تعامل کے لیے بھی چونے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ سیمنٹ جیسے مرکبات زمین (کے ذرات) کو جکڑ دیتے ہیں جس سے اس کی مضبوطی اور استحکام میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں دیہی علاقوں میں سڑکیں بنانے کی ٹیکنالوجی میں کافی بہتری پیدا ہو چکی ہے اور آئندہ ہونے والی ترقی سے اس کام کو مزید تقویت ملے گی۔

ماحولیاتی انتظام و انصرام کے میدان میں ہندوستانی سائنس دانوں نے ایسی سہولیات فروغ دی ہیں جنھیں بروئے کار لا کر ریڈیو، ایٹمی فضلوں، ایٹامک پاور پلانٹوں سے بہہ کر آنے والے کیمیاوی مرکبات اور بے کار پانی کی اصلاح کا انتظام و انصرام کیا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں نے میونسپل فضلوں سے بجلی پیدا کی ہے اور قدیم ہندوستانی کلچر اور تہذیب کی علامت گنگا کی صفائی جیسے عظیم کام کا بیڑا بھی اٹھایا ہے۔ گنگا ایکشن پلان کا خاص کام یہ ہے کہ گنگا کے پانی کو پھر سے پاک بنا دیا جائے، آلودہ پانی کے بہاؤ کو گنگا میں نہ انڈیلنے دیا جائے اور یہ کام تب ہی ہو سکتا ہے جب سیوریج پمپنگ اور ٹریٹمنٹ پلانٹوں کی تجدید کی جائے اور کچھ نئے پلانٹ نصب کیے جائیں۔

ہوا کی کوالٹی پر نگرانی رکھنے، آلودگی پر قابو رکھنے، آبی کیمیا اور آبی عمل آوری، ٹھوس فضلوں کے انتظام و انصرام، دیہی صفائی ستھرائی اور وبائی مرضیات کے میدانوں میں بھی کام ہوا ہے۔ دی ڈیپارٹمنٹ آف این وائرنمنٹ یا DOE جن باتوں پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے وہ ہیں: ماحولیاتی اور ایکولوجیکل ریسرچ۔ ماحولیاتی اثر کی تحسیب، ماحولیاتی کوالٹی پر نگرانی رکھنا، ماحولیاتی معلومات فراہم کرانے کا نظام قائم کرنا، نازک ایکوسٹمس کو برقرار رکھنا، ایکولوجیکل وسائل کی فہرست (تیار کرنا) زمین اور پانی کو محفوظ رکھنا، جنگلات کو تحفظ فراہم کرانا اور شجر کاری کرنا، سماجی جنگل بانی، معاشی اور صنعتی شجر کاری، توانائی شجر کاری پینے کے پانی کی فراہمی اور صفائی ستھرائی۔ نیشنل این وائرنمینٹل انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ یا NEERI ناگپور میں جن میدانوں میں بہت زیادہ زور دیا جا رہا ہے وہ ہیں: ایکوا کلچر کے ذریعے بے کار پانی کی اصلاح کرنا، صنعتی اور گھریلو بے کار پانی کو بہترین انداز میں زراعت میں استعمال کرنا اور حیاتیاتی طریقوں سے فینول اور سائنائڈ بردار فضلہ سے زہریلے اثرات ختم کرنا۔ NEERI نے ایک اور کام اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے اور وہ ہے سوریج اور صنعتی فضلوں پر کیے جانے والے مطالعوں اور ان پر عمل آوری کا کام کیونکہ 250 سے بھی زیادہ صنعتیں ایسی ہیں جو مصنوعی دوائیں، دوا سازی سے متعلقہ، سامان، کاغذ اور لگدی (Paper and pulp)، اسٹرا بورڈ (straw board) این ین، کیمیاوی مرکبات، بہت زیادہ دھماکہ خیز اشیا اور فرٹی لائزرس بڑے پیمانے پر تیار کر رہی ہیں۔ پچاس سے بھی زیادہ شہروں کے ٹھوس فضلوں کی خصوصیات کو ہوشیاری سے مدنظر رکھتے ہوئے NEERI نے ڈیزائن کاری کر کے مناسب میکانیکی حصوں پر مبنی پلانٹ فروغ دیے ہیں۔

ٹھوس فضلوں سے وسائل کی بازیابی کے لیے ایک کامیاب تکنیک اور بھی ہے اور وہ ہے ہوا کی غیر موجودگی یا کنٹرول شدہ آکسیجن ماحول میں کاربن بردار مادوں کی کیمیاوی تحلیل کی ترکیب، یہ ایک ایسی ترکیب ہے کہ جس کا فائدہ یہ ہے کہ اسے اختیار کر کے فضلہ کا حجم 90-80 فیصد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ہوائی آلودگی پھیلنے کے کم سے کم مواقع پیدا ہو سکتے ہیں اور اس کے لیے درکار زمینی رقبہ بھی نسبتاً کم ہوتا ہے۔ آتش پاشیدگی اور بالواسطہ گیسی فیکیشن (gasification) سے پیدا ہونے والی شئے ایندھن گیس ہوتی ہے جو عام طور پر کاربن مونو آکسائڈ، ہائڈروجن، میتھین کاربن ڈائی آکسائڈ اور چارکول پر مشتمل ہوتی ہے۔ حال ہی میں حکومت ہند نے ایک نیا قانون این وائرنمینٹ (پروٹیکشن) نافذ کیا ہے، اس کا مقصد آلودگی پر قابو پانا اور نباتات و حیوانات کی حفاظت کرنا ہے۔ اس قانون کی رو سے ہر ایک شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماحول کو نقصان پہنچانے والی پارٹیوں کے خلاف قانون سے مدد لے سکتا ہے۔

□□□

ترجمہ — سید مرغوب احمد

سید محمد محسن

احساس اور جذبہ

کسی دوست سے ایک طویل مدت کے بعد ملاقات سامان مسرت فراہم کرتی ہے۔ اس دوست کی بیماری کی خبر سے آپ افسردہ ہو جاتے ہیں۔ طلوع آفتاب کے نظارے سے آپ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جب کبھی اسٹیشن پر آپ کی گاڑی چھوٹ جاتی ہے تو آپ کو صدمہ ہوتا ہے۔ یہ تمام کیفیتیں احساسات ہیں بعض خوش گوار بعض ناخوش گوار۔ آپ کے بیشتر تجربے یا اعمال آپ کے اندر احساسات پیدا کرتے ہیں۔۔ بعض تجربے یا اعمال ایسے ہوتے ہیں جو نہ تو لطف پیدا کرتے ہیں اور نہ ہی بے لطفی۔ اگر آپ کسی شخص سے روزانہ ملاقات کرتے ہیں تو ممکن ہے یہ ملاقات آپ کے اندر لطف یا بے لطفی نہ پیدا کرے۔ اسی طرح آپ جب روزمرہ کے اعمال انجام دیتے ہیں مثلاً جوتوں کے فیتے باندھنا یا سائیکل سے کالج جانا وغیرہ تو عموماً یہ اعمال کوئی لطف یا بے لطفی نہیں پیدا کرتے۔ ان حالات میں آپ کے احساسات کو بے رنگ کہا جائے گا۔ بے رنگ احساس نا احساسیت کے مترادف ہے۔

جب احساس بہت ہلکا ہوتا ہے تو ہم اس سے باخبر نہیں ہوتے۔ آپ کو اگر مقررہ وقت پر کھانا مل جاتا ہے تو اسے کھاتے وقت آپ بہت ہلکی لذت محسوس کرتے ہیں لیکن اگر آپ بھوکے ہیں اور کھانا تیار نہیں ہے تو آپ کو ناخوش گواری کا احساس ہوتا ہے۔ وہ احساس اور شدید ہو جائے گا اگر آپ کو کھانے کے لیے زیادہ دیر تک انتظار کرنا پڑے اور ایسے میں کھانا پیش کیا جائے گا تو آپ اس سے لطف اندوز ہوں گے۔ کھانے کا خوش گوار احساس قوی ہو جائے گا۔ اس طرح احساسات کی شدت مختلف ہوتی ہے۔

ہماری پسند اور ناپسند احساسات کے ساتھ قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ عموماً ایک شخص ان اشیا اور اعمال کو پسند کرتا ہے جو خوش گوار احساسات پیدا کرتے ہیں اور جو اشیا یا اعمال ناخوش گوار احساسات پیدا کرتے ہیں انھیں وہ ناپسند کرتا ہے۔ ہماری پسند اور ناپسند ہماری دلچسپیوں کو تشکیل دیتی ہیں۔ پسند مثبت دل چسپی ہے اور ناپسند منفی دل چسپی ہے۔ جس چیز کو ایک شخص پسند کرتا ہے وہ چیز اس کو اسی طرف کھینچتی ہے۔ وہ شخص اس چیز میں دل چسپی رکھتا ہے۔ وہ چیز اس کے اندر خوش گوار احساسات پیدا کرتی ہے۔ جس چیز کو ایک شخص ناپسند کرتا ہے وہ اس میں کراہت پیدا کرتی ہے۔ وہ اس سے تنگ آجاتا ہے اور اس کے اندر ناگواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شخص کسی چیز یا عمل کو نہ تو پسند کرتا ہے اور نہ ناپسند تو وہ اس سے بے غرض ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق اس کے احساسات بے تعلق ہوتے ہیں۔

جب کسی چیز یا عمل کے لیے پسند بہت قوی ہو جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ ہم لوگ اس چیز، شخص یا عمل کی قدر کرتے ہیں۔ کسی چیز کی طبعی یا مادی قدر اس کی نفسیاتی قدر سے مختلف ہوتی ہے۔ مشتاق سامعین کے سامنے اپنی نظم سنانا ایک شاعر کے لیے نفسیاتی قدر رکھتا ہے۔ اس کے لیے ممکن ہے اس میں کوئی مادی یا طبعی قدر نہ ہو۔ اس سے اسے کوئی واضح صلہ نہیں ملتا۔ ایک کان کن کے لیے کان میں کام کرنا مادی قدر رکھتا ہے۔ اس سے وہ روپے کماتا ہے۔ لیکن اس کے لیے کوئی نفسیاتی قدر نہیں رکھتا۔ ممکن ہے کہ کچھ روپے بچا لینے کے بعد وہ اپنے پیشے کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کرے۔ اس لیے کہ دوسرا پیشہ اس کے لیے نفسیاتی قدر کا حامل ہے۔ اس کام کو اور جس حالت میں وہ کام انجام دیا جاتا ہے اسے وہ پسند کرتا ہے۔ بعض اوقات نفسیاتی قدر مادی قدر کی بہ نسبت زیادہ طاقتور ہو جاتی ہے۔ مہاتما گاندھی مادی تکلیفوں میں مبتلا رہے کیونکہ ملک کی آزادی ان کے لیے بہت ہی قوی نفسیاتی قدر رکھتی تھی۔ ایک سائنس داں اکثر اپنی ذاتی حفاظت اور زندگی کو خطرے میں ڈال دیتا ہے کیونکہ انکشاف کرنے کی تسکین اس کے لیے ایک قوی نفسیاتی قدر رکھتی ہے۔

کسی چیز کی نفسیاتی قدر اس شے سے پیدا شدہ احساسات کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ہے۔ اگر ایک چیز کسی شخص کے لیے ہمیشہ خوش گوار احساسات پیدا کرتی ہے تو وہ چیز اس کے لیے ایک قدر رکھتی ہے۔ کسی کام میں کامیابی ایک شخص کے لیے قدر رکھتی ہے کیونکہ کامیابی خوش گوار احساسات پیدا کرتی ہے۔ دوسری طرف ناکامی کو ہم ناپسند کرتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے منفی قدر رکھتی ہے کیونکہ یہ ناگوار احساسات پیدا کرتی ہے۔ قدر بھی دلچسپی اور احساس کی طرف

''ابتدائی نفسیات'' سے ماخوذ صفحات: 240 قیمت : -/61روپئے

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

منفی یا مثبت ہوسکتی ہے۔ اسی طرح احساسات کی طرح دلچسپیاں اور قدریں دونوں بے رنگ Neutral بھی ہوسکتی ہیں۔ وہ چیزیں یا اعمال جنھیں ایک شخص نہ تو پسند کرتا ہے اور نہ ناپسند، اس کے لیے ایک بے رنگ قدر رکھتی ہیں۔ وہ ان سے بے تعلق ہوتا ہے۔ دوسرے ملک کی آزادی ہم میں سے بیشتر لوگوں کے لیے ایک بے رنگ قدر رکھتی ہے لیکن ہمارے اپنے ملک کی آزادی ہمارے لیے ایک قوی مثبت قدر رکھتی ہے۔

ہم جس چیز کی قدر کرتے ہیں اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور اس چیز کو رد کرتے ہیں جو ہمارے لیے منفی قدر رکھتی ہے۔ بعض اوقات یہ میلان یا تردید ہمارے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ یہ ہمارے کردار کو متاثر کرتی ہے۔ ایک شخص مذہب کی قدر کرتا ہے۔ اسے مذہبی عقیدے اور رسم ورواج کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کسی دوسرے شخص کے لیے مذہب ایک منفی قدر پیدا کرے۔ اسے مذہبی عقیدے اور رسومات سے بے رغبتی ہوگی۔ ہم کہتے ہیں کہ پہلا شخص مذہب کی طرف جانب دارانہ رویہ رکھتا ہے۔ دوسرا شخص مذہب کے لیے غیر جانب دارانہ رویہ رکھتا ہے۔ ایک شخص مذہب، ذات پات اور ایسی ہی دوسری چیزوں یا مسئلوں کی طرف جانب دارانہ رویہ رکھ سکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص، بعض اشخاص یا گروہ مثلاً چینیوں کے لیے یا اپنے دفتر کے سربراہ کے لیے یا کسی سیاسی فرد کے لیے ایسا ہی رویہ رکھے۔ اس شخص یا اس گروہ کے متعلق اس کے رویے اس کی رائے کو متاثر کریں گے اور اس شخص یا اس گروہ سے متعلق اس کے عمل کو بھی متاثر کریں گے۔ اگر آپ کسی خاص شخص کے لیے جانب دارانہ رویہ رکھتے ہیں تو آپ اس کی مدد کے لیے اس کے متعلق اچھی رائے قائم کرنے کے لیے اور اس کی صحبت کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار رہیں گے لیکن اگر آپ کسی دوسرے شخص کے لیے غیر جانب دارانہ رویہ رکھتے ہیں تو یقیناً آپ اس کے بارے میں غلط رائے قائم کریں گے۔

جب کوئی شخص خائف یا غضبناک ہوتا ہے تو اسے غصے کا جذبہ ہوتا ہے۔ جب کوئی خندہ انگیز فلم آپ کو ہنساتی ہے تو آپ کو مسرت کا جذبہ ہوتا ہے۔ جب ماں اپنے بچے کو اپنے سینے سے چمٹالیتی ہے تو اس کو محبت کا جذبہ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف جب آپ غصہ یا خائف ہوتے ہیں تو آپ کو ناگوار احساس ہوتا ہے۔ جب آپ مسرور ہوتے ہیں یا اپنی محبت اور شفقت کا اظہار کرتے ہیں تو آپ کو خوش گوار احساس ہوتا ہے۔ اس طرح جذبے میں احساس کا عنصر بھی شامل ہے لیکن جذبہ کو ہم صرف احساس نہیں کہہ سکتے۔ یہ زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ اس میں احساس کے علاوہ عام جسمانی اعمال بھی شامل ہوتے ہیں۔ جب آپ غصہ ہوتے ہیں تو آپ کو صرف ناگوار احساس ہی نہیں ہوتا، آپ کے طبیعی اعمال میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ آپ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ آپ کا تنفس تیز ہو جاتا ہے۔ آپ کی آواز بلند اور تیز ہو جاتی ہے۔ آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ آپ کے پورے جسم پر ایک بسیط عمل کا قبضہ ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ کے طبیعی افعال میں اس وقت بھی تغیر واقع ہوتا ہے جب آپ خائف، مسرور یا مغموم ہوتے ہیں۔ اس لیے جذبہ نظام جسمانی کی ایک مختل حالت ہے جس میں کچھ خوش گوار یا ناگوار احساس بھی شامل رہتا ہے۔

احساس ہی کی طرح جذبہ بھی شدت میں زیادہ یا کم ہوسکتا ہے۔ زیادہ شدید جذبات میں جسم کے معمول افعال کا اختلال زیادہ بسیط اور واضح ہوتا ہے۔ دوسرے اشخاص اسے آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ کم شدت کے جذبات میں یہ اختلال پورے جسم پر ساری نہیں ہوتا اور نہ بہت واضح ہوتا ہے۔ ممکن ہے وہ دوسروں کو متوجہ نہ کر سکے۔ اگر کوئی شخص غصہ کی حالت میں ہوتا ہے تو وہاں پر موجود سبھی لوگوں کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ جسمانی تغیرات جو اس میں پیدا ہوتے ہیں بہ آسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ غصے کے ہلکے جذبے کو خفگی کہتے ہیں۔ خفگی کی علامتیں بہت زیادہ واضح نہیں ہوتیں۔ اسی طرح خوف کا ایک شدید جذبہ بھی پورے جسم کے اندر واضح تغیرات پیدا کرتا ہے جسے دہشت کی حالت کہا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہوسکتا ہے کہ خوف صرف چہرے کے پھیکے پن اور بے چینی کی علامت سے ظاہر ہو جو ممکن ہے بہت واضح نہ ہو۔

جب ایک شخص جذبے کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کے ذہنی افعال بھی مختلف ہو جاتے ہیں اگر آپ غصے میں ہیں تو آپ کے لیے کسی عمل پر توجہ مرکوز کرنا مشکل ہوگا۔ آپ کسی چیز یا کسی حالت کا واضح ادراک نہیں کر سکتے۔ آپ اس چیز کی بازیافت میں ناکام ہوسکتے ہیں جسے آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ کی یادداشت بہ خوبی کام نہیں کرتی۔ آپ جو کچھ پڑھتے ہیں اسے سمجھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ آپ اچھی طرح فکر نہیں کر سکتے۔ اس طرح جذبات انسان کے روزمرہ کے افعال اور عملی مطابقت میں مشکلیں پیدا کرتے ہیں۔ بعض لوگ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے جذباتی حالت میں آجاتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی بات واقع ہو جائے جسے وہ پسند نہیں کرتے تو انھیں غصہ آجاتا ہے۔ ہم انھیں تنک مزاج کہتے ہیں۔ کچھ لوگ جو بہت ڈرپوک ہوتے ہیں وہ بہت آسانی سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی خواہش کے مطابق کوئی بات ہو جانے پر حد سے زیادہ خوش ہو جاتے ہیں وہ بہت زیادہ مشتعل مزاج ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے جذبہ بعض اوقات رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اپنے فرائض کو اطمینان بخش طور پر انجام دینا یا عام طور سے دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ان کے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔

بچہ بہت زیادہ جذباتی ہوتا ہے۔ اس پر غیظ کا دورہ یا ہول کی حالت بہت آسانی سے حاوی ہو جاتی ہے۔ جسمانی اعمال جو اس کے جذبات کے ساتھ

شامل ہوتے ہیں بہت نمایاں اور بالکل واضح ہوتے ہیں۔ وہ چیختا ہے، چلاتا ہے۔ زمین پر لوٹ جاتا ہے۔ دانت کاٹتا ہے، ہنسی اڑاتا ہے، کانپتا ہے پیلا پڑ جاتا ہے لیکن جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا ہے وہ اپنے جذبات پر زیادہ سے زیادہ قابو پاتا ہے۔ جذبات کے جسمانی اظہار عموماً ضبط شدہ ہوتے ہیں۔ وہ عام واقعہ سے اتنی ہی آسانی سے مضطرب نہیں ہو جاتا۔ اس پر آسانی سے ہیجان، خوف یا غصے کا دورہ نہیں پڑتا، وہ جذباتی استحکام کو قائم رکھتا ہے۔ ایک بالغ شخص عموماً اپنے جذبات پر مکمل قابو رکھتا ہے۔ وہ جذباتی طور پر مستحکم رہتا ہے اور اپنے ماحول کے تغیرات سے بہ آسانی متاثر نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بالغ شخص اپنے جذبات پر پورا قابو نہیں رکھتا تو ہم اسے جذباتی طور پر غیر پختہ کہتے ہیں۔ بالغ ہونے کے باوجود وہ جذباتی حالات میں ایک بچے جیسا کردار پیش کرتا ہے۔

جذباتی طور پر ناپختہ بالغ خطرہ پیش آنے پر چلانے اور فریاد کرنے لگتا ہے۔ وہ دانت کاٹتا ہے اور ہنسی اڑاتا ہے اور اس شخص پر تھوکتا ہے جو اس کی خواہشوں کو پورا نہیں کرتا۔ جب وہ کسی کام میں کامیاب ہوتا ہے تو خوشی سے اچھلنے اور ناچنے لگتا ہے یہ سب جذباتی ناپختگی کی انتہائی شکلیں ہیں۔ معمولی طور پر اگر کوئی بالغ شخص جذباتی حالت میں بالغوں کی طرح برتاؤ نہیں کرتا تو وہ جذباتی پختگی کا محتاج ہوتا ہے۔ جذبات جسم کو غیر معمولی حالت یعنی ہنگامی صورت حال سے مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ جانور جب جذبے کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کے جسمانی اعمال زیادہ شدید ہو جاتے ہیں، انھیں زیادہ قوت ملتی ہے۔ جذبات کے ہنگامی نظریے کا اطلاق انسانی جذبات پر نہیں ہوتا۔ انسان ہنگامی حالات کا مقابلہ عموماً قوی جسمانی افعال کے ذریعے نہیں کرتا بلکہ وہ ان کا مقابلہ قوی ذہنی افعال کے ذریعے کرتا ہے۔ جب حالات غیر معمولی ہوں تو ان سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے انسان کو ان حالات اور ان کی تفصیلات کو اچھی طرح سمجھنے اور درک کرنے کا اہل ہونا چاہیے۔ اسے ان حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے ممکن راستوں کے متعلق باقاعدہ سوچنے کا بھی اہل ہونا چاہیے۔ اس کے تمام ذہنی افعال کو اس وقت بلند معیار پر کام کرنا چاہیے۔ انسان کو جب اسے غیر معمولی حالات سے مقابلہ کرنا ہو تو جذبات پر زیادہ سے زیادہ قابو رکھنا چاہیے۔ جذبات کا ہنگامی نظریہ شاید غاروں میں بسر کرنے والے انسان پر صادق آتا تھا جب وہ ابتدائی حالت میں تھا۔ ابتدائی حالت میں انسان کے ذہنی افعال جسمانی قوت کے مقابلے میں معمولی اور کم قابل قدر تھے۔ تہذیب کی ترقی نے انسان کے ذہنی افعال کو بڑا سے بڑا ارتقا بخشا ہے۔ ایک مہذب انسان بہت ہی پیچیدہ ذہنی افعال کا اہل ہوتا ہے۔ ان کا اظہار ان نہایت پیچیدہ ایجادات میں ہوتا ہے جو آج کے انسان کی ہیں۔ ان کے ذریعے وہ قدرتی طاقتوں کو سر کرنے کا اہل ہو گیا ہے۔ جذبات کا بے ضبط اظہار مہذب معاشرے میں انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ جذبات پر ضبط تہذیب اور کلچر کی نشانی ہے۔ اس لیے تعلیم کو جذبات پر قابو حاصل کرنے کی تربیت کہا گیا ہے یہ تعلیم ہی ہے جو انسان کو مہذب اور متمدن بناتی ہے۔

جب کوئی شخص غصے یا خوف کی حالت میں ہوتا ہے اس وقت وہاں کوئی تو ایسی چیز ضرور ہوتی ہے جو اسے غضبناک یا خوف زدہ بناتی ہے۔ کوئی چیز، شخص یا حالت ایسی ہوتی ہے جس کا اسے ادراک ہوتا ہے یا جس کے متعلق یاد دہانی ہوتی ہے۔ یہ اس کے عضوئے حس کو متحرک کرتی ہے جو اضطراری تحریکات اس کے عضوئے حس میں پیدا ہوتی ہیں وہ قشر تک پہنچتی ہیں اور وہ اس چیز، شخص یا حالت سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ایک بچہ میدان میں بیٹھا ہے۔ اچانک ایک سانپ قریب میں حرکت کرنے لگتا ہے۔ وہ سانپ کا درک کرتا ہے۔ وہ اس سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ہم عموماً یہ یقین کرتے ہیں کہ جس لمحے وہ سانپ کا درک کرتا ہے اسے خوف کا تجربہ ہوتا ہے۔ یعنی وہ خوف زدہ ہو جاتا ہے اور خوف اس میں کچھ جسمانی جوابی عمل پیدا کرتا ہے۔ وہ اس جگہ سے بھاگ جاتا ہے اور خوف زدہ نظر آتا ہے۔ اس طرح ادراک خوف کا جذباتی تجربہ پیدا کرتا ہے اور یہ جذباتی تجربہ اپنی باری میں خوف کا جسمانی جوابی عمل پیدا کرتا ہے۔ جذبات کی توضیح کے اس طریقے کو جذبات کا عام فہم نظریہ کہتے ہیں۔ ایک نظریے کے مطابق سانپ کا خوف سانپ کے ادراک کے فوراً بعد واقع نہیں ہوتا۔ ادراک جسم کے اندر بعض دوسرے افعال مثلاً زیادہ تیز دوران خون، تیز تنفس وغیرہ کے ساتھ پہلے کودنے یا دوڑنے کا عمل پیدا کرتا ہے۔ یہ افعال جسم کے داخلی آخذ ـــ مثلاً حرکی آخذ اور عضوی آخذ ـــ کو مہیج کرتے ہیں۔ ان آخذوں سے دماغ تک اثرات پہنچتے ہیں اور حرکی عضوی احساسات کا ایک مجموعہ پیدا کرتے ہیں۔ احساسات کا یہی مجموعہ، ہمارے خوف کے تجربے کی تشکیل کرتا ہے۔ خوف، غصہ یا دوسرے جذبات کی حالت جس کا کسی شخص کو تجربہ ہوتا ہے اس نظریے کے مطابق جسم کے خلل پذیر افعال سے پیدا شدہ احساسات کا ایک بے ترتیب مجموعہ ہوتا ہے۔ اس نظریے کو نظریہ جذبات کہا گیا ہے۔ جنھوں نے الگ الگ اس نظریے کو تجویز کیا تھا۔ اس نظریے کے مطابق کسی معروض کے ادراک کے بعد خلل پذیر جسمانی افعال واقع ہوتے ہیں اور جسمانی افعال کے بعد بے ترتیب احساسات واقع ہوتے ہیں جن سے کوئی شخص غصہ یا خوف کی حالت کے طور پر آگاہ ہوتا ہے۔ جیمس نے کہا ہے ''ہم اس لیے نہیں بھاگتے کہ ہم خوف زدہ ہوتے ہیں بلکہ ہم خوف زدہ اس لیے ہوتے ہیں کہ ہم بھاگتے ہیں۔'' یا '' ہم اس لیے نہیں مارتے کہ ہم غضب ناک ہوتے ہیں بلکہ ہم اس لیے غضب ناک ہوئے ہیں کہ ہم مارتے ہیں۔''

جذبات کا ایک اور نظریہ ہے جسے کینن بارڈ نظریہ کہتے ہیں۔ اسی نظریے

کے مطابق چیز کے ادراک کے بعد خلل پذیر جسمانی افعال اور جذباتی تجربہ دونوں واقع ہوتے ہیں۔ دونوں ایک ساتھ واقع ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پیدا نہیں کرتے۔ ایک شخص دوسرے شخص کو گالی دیتا ہے۔ وہ گالی سنتا ہے جو اس کے لیے باعث توہین ہوتی ہے۔ وہ غضبناک ہو جاتا ہے اور دوسرے شخص پر ٹوٹ پڑتا ہے یا جواب میں اس کو گالی دیتا ہے۔ غصہ اس کے پورے عضویہ کی خلل پذیر حالت نیز اس کے غصے کی حالت کے تجربے پر مشتمل ہوتا ہے۔ خلل پذیر جسمانی افعال اور غصے کا باشعور تجربہ دونوں ایک ساتھ واقع ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نظریے کے مطابق غصے کا تجربہ خلل پذیر افعال کی پیداوار نہیں ہوتا۔ باشعور تجربہ احساسات کا بے ترتیب مجموعہ نہیں ہوتا جیسا کہ جیمس اور لینگ نے خیال ظاہر کیا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ معروض کا ادراک قشر میں اضطراری تحریکیں پیدا کرتا ہے جو وسطی دماغ کے ایک خاص حصے تک پہنچتی ہیں۔ وسطی دماغ کے اس حصے کو مبدائے اعصاب کہتے ہیں۔ مبدائے اعصاب سے ان اضطراری تحریکوں کا ایک حصہ جسم کے اثر انداز عضلات یعنی عضلات اور غدود تک پہنچتا ہے۔ دوسرا حصہ مبدائے اعصاب سے قشریہ میں واپس آتا ہے اور جذباتی تجربے میں منتج ہوتا ہے۔ وہ اضطراری تحریکات جو اثر انداز عضلات تک پہنچتی ہیں۔ خلل پذیر جسمانی تغیرات پیدا کرتی ہیں۔ جذباتی تجربہ، غصہ یا خوف کا احساس جو ایک شخص بیان کرتا ہے۔ مبدائے اعصاب کی حرکت کا نتیجہ ہوتا ہے جو اضطراری تحریکوں کو قشریہ میں بھیجتا ہے اس لیے اس نظریے کو جذبات کا مبدائے اعصابی نظریہ بھی کہتے ہیں۔ جسمانی تغیرات اور جذباتی تجربہ ایک ساتھ واقع ہوتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے بعد واقع یا ایک دوسرے سے پیدا نہیں ہوتے۔ وسطی دماغ میں موجود مبدائے اعصاب جذبات کے تجربے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر دماغ کے اس حصے کو ناقص کر دیا جائے یا اسے قشر سے علاحدہ کر دیا جائے تو انسان شدید جذباتی تجربات سے محروم ہو جائے گا۔ اس طرح مبدائے اعصاب کو جذبات کا مرکز پایا گیا ہے۔

جذبات کی متعدد قسمیں ہیں جیسے غصہ، خوف، خوشی، غم، کراہت، تشویش، پریشانی، غرور، شرم، محبت، حسد وغیرہ۔ جب کوئی شخص غصے میں ہوتا ہے تو وہ یہ جانتا ہے کہ وہ غصے میں ہے، خوف زدہ یا مسرور نہیں۔ اسی طرح جب وہ خوف زدہ ہوتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ وہ خوف زدہ ہے۔ چنانچہ باشعور تجربے کی حیثیت سے ایک جذبہ دوسرے جذبے سے مختلف ہوتا ہے لیکن یہ ان جسمانی اعمال کے لیے صحیح نہیں جو جذباتی تجربے میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک قسم کے جذبے کے جسمانی اعمال دوسری قسم کے جذبے کے جسمانی اعمال سے بالکل مختلف نہ ہوں، مثال کے طور پر غصہ اور خوف دونوں حالتوں میں دوران خون میں تیزی اور تنفس میں شورش پیدا ہوسکتی ہے۔ انتہائی مسرت میں بھی کچھ جسمانی تغیرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ صرف اندرونی جسمانی تغیرات ہی نہیں بلکہ ممکن ہے جذبات کا بیرونی اظہار بھی یکسر مختلف نہ ہو۔ بعض اوقات کسی شخص کے چہرے کے تاثرات یا جسمانی انداز سے یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ آیا وہ غصے میں ہے، خوف زدہ ہے یا مغموم ہے اس لیے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جذبات میں شامل جسمانی تغیرات کی بنیاد پر جذبات کی درجہ بندی کرنا ممکن نہیں ہے۔ جذبات میں پیدا ہونے والے نہایت خفیف جسمانی تغیرات کا مشاہدہ کرنے اور انھیں قلم بند کرنے کے لیے متعدد ترکیبیں معلوم کی گئی ہیں۔ دل کی دھڑکن، تنفس، دوران خون، خون کے دباؤ، خون کی ترکیب، جلد کی برقی مزاحمت وغیرہ کے لیے پیمائشی آلات بنائے جا چکے ہیں۔ اس مقصد کے لیے بہت ہی نازک اور حساس آلات استعمال کیے جاتے ہیں لیکن نتائج یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مختلف قسم کے جذباتی تجربوں کے لیے مختلف انداز کے جسمانی تغیرات نہیں ہوتے۔ اس لیے جذبہ ایک بہت ہی پیچیدہ کردار ہے جو خلل پذیر جسمانی افعال کے بے ترتیب مجموعے اور ایک مخصوص شعوری تجربے پر مشتمل ہوتا ہے۔

غصے اور خوف کے جذبات بہت ہی اہم جذبات ہیں۔ ہر ایک کا شعوری تجربہ دوسرے سے الگ ہوتا ہے۔ جب آپ غصے میں ہوتے ہیں تو یہ جانتے ہیں کہ آپ غصے میں ہیں، خوف زدہ نہیں۔ جب آپ خوف زدہ ہوتے ہیں تب بھی یہ جانتے ہیں کہ آپ خوف زدہ ہیں، غصے میں نہیں۔ دونوں جذبات میں بعض جسمانی تغیرات مماثل ہوتے ہیں اور دوسرے مختلف۔ مثال کے طور پر چہرہ خوف میں عموماً سفید اور غصہ میں سرخ ہو جاتا ہے۔ جب کہ دونوں میں تنفس تیز یا موقوف ہوسکتا ہے اس کے باوجود دونوں جذبات کے اسباب بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ بچوں میں خوف اچانک زوردار آواز اور سہارے کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اچانک زوردار آواز بالغوں میں بھی خوف پیدا کرتی ہے۔ بہت سے بالغان بجلی کی گرجدار آواز پر خوف سے کانپ جاتے ہیں۔ عموماً جب کوئی ناگہانی آواز نامانوس ہوتی ہے تو بالغ افراد میں خوف پیدا کرتی ہے۔ بالغوں میں خطرے کا خدشہ خوف کی خاص وجہ ہوتا ہے۔ خطرے کا احساس کسی شخص کے تحفظ اور اس کی زندگی کے لیے ایک انتباہ ہوتا ہے۔ اس لیے عدم تحفظ کی حالت میں بھی خوف پیدا کرتی ہے۔ اگر عدم تحفظ کی حس قائم ہو جاتی ہے تو یہ خوف کی وہ قسم پیدا کرتی ہے جسے تشویش کہتے ہیں۔ تشویش خوف کی وہ حالت ہے جو کسی متوقع خطرے سے پیدا ہوتی ہے اور جس سے بچنے کے لیے انسان کچھ کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ایک شفیق ماں کو اپنے اکلوتے بچے کی صحت کے متعلق یا کسی مشغول سڑک سے ہو کر اسکول سے اس کی واپسی کے لیے تشویش ہوسکتی ہے۔

غصے کا جذبہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی شخص کی حرکت یا عمل میں

رکاوٹ پیش آتی ہے۔ جب آپ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں اور کوئی چیز یا کوئی شخص آپ کے راستے میں حائل ہوتا ہے تو آپ غصہ ہو جاتے ہیں۔ آپ ایک کمرے کا تالا کھولنا چاہتے ہیں۔ آپ کنجی کے ایک گچھے سے کوشش کرتے ہیں لیکن کوئی کنجی اس تالے میں نہیں لگتی ہے۔ آپ غصے میں کنجی کے اس گچھے کو پھینک دیتے ہیں۔ آپ کسی کام کو ایک طریقے سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ کسی دوسرے طریقے سے کیا جاتا ہے۔ یہ بات آپ میں غصہ پیدا کرتی ہے۔ آپ اپنی خودداری اور سماجی وقار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ کوئی شخص آپ کی ہتک کرنے کے لیے کچھ کرتا ہے۔ آپ اس سے غصہ ہو جاتے ہیں۔ صرف آپ کے عمل میں رکاوٹ نہیں بلکہ آپ کی خواہشوں اور ضرورتوں میں رکاوٹ بھی آپ میں غصہ پیدا کرتی ہے۔

جب آپ کسی شخص سے غصہ ہوتے ہیں تو آپ اس پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ آپ کا کردار جارحانہ ہو جاتا ہے۔ وہ حملہ زبانی بھی ہو سکتا ہے۔ آپ اسے برا بھلا کہتے ہیں۔ اس کو گالی دیتے ہیں، اس پر تہمت لگاتے ہیں وغیرہ۔ بعض اوقات اگر آپ اس شخص پر جس نے آپ کو غصہ دلایا ہے کامیابی کے ساتھ حملہ نہیں کر پاتے تو آپ اپنے غصے کا اظہار کسی دوسرے پر کرتے ہیں۔ ایک بیوی جب اپنے شوہر سے، جو اس سے بہت زیادہ قوی ہوتا ہے، غصہ ہوتی ہے تو وہ اپنا غصہ اپنے بچے پر نکالتی ہے کسی آفس کا ماتحت جب اپنے افسر کے ذریعے ذلیل کیا جاتا ہے تو واپس آکر وہ اپنے غصے کا اظہار اپنے گھر والوں پر کرتا ہے۔ ماہرین نفسیات اسے منتقلہ جارحیت کہتے ہیں۔ اس میں غصہ حقیقی ذریعے کی طرف منعطف ہونے کی بجائے بعض دوسری چیز یا شخص کی طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کسی خط کے مضمون سے آزردہ ہوتے ہیں تو آپ بعض اوقات اس خط کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور پاؤں کے نیچے کچل دیتے ہیں۔

خوف غصے سے اس کردار میں مختلف ہوتا ہے جو اس سے پیدا ہوتا ہے۔ جب آپ خوف زدہ ہوتے ہیں تو آپ خوف کے ماخذ سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ غصہ حملہ پیدا کرتا ہے اور خوف فرار پیدا کرتا ہے۔ غصہ ایک مثبت جوابی عمل پیدا کرتا ہے۔ خوف ایک منفی جوابی عمل پیدا کرتا ہے۔ خوف بعض اوقات مکمل بے عملی بھی پیدا کر سکتا ہے۔ دہشت کی حالت میں ممکن ہے ایک شخص حرکت کرنے کے لائق بھی نہ رہے۔ ہوسکتا ہے اس کے اعضا مفلوج ہو جائیں۔ بعض اوقات وہ شعور بھی کھو سکتا ہے۔

اکثر کوئی شخص خوفناک حالت سے بھاگ کر بچ نہیں سکتا۔ خوف بار بار اس کے ذہن میں آتا ہے۔ بعض اوقات بھاگنا بھی ممکن نہیں رہتا۔ اس حالت سے احتراز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک شخص نے کوئی غلطی کی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کا جرم افشا ہو جائے گا۔ وہ اس سزا سے خوف کھاتا ہے جو اسے ملے گی۔ وہ خوف پر قابو نہیں پاسکتا۔ اس خوف سے فرار کا صرف یہی راستہ ہے کہ وہ اس حالت کو بھول جائے جس میں وہ خوف پیدا ہوا تھا۔ بعض اوقات متواتر خوف سے ذہنی عارضہ پیدا ہوسکتا ہے۔ وہ شخص اپنے ماحول سے تعلق کھو بیٹھتا ہے۔ وہ اپنے ماحول سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ حقیقی دنیا کے خوف، تشویش اور پریشانیوں سے خیالی دنیا میں پناہ لیتا ہے۔ اس کی دنیا وہ ہوتی ہے جس میں وہ چیزوں کو ویسا تصور کرتا ہے جیسا وہ خود چاہتا ہے۔ وہ ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے۔

□□□

ترجمہ — محمد رضوان احمد خاں

تیز تر اور دور تر (نقل وحمل کی کہانی)

مصنف: میر نجابت علی / مترجم: مہ جبیں اختر

نقل وحمل انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے سے لے کر مختلف افراد سے ملنے اور دیگر ضروریات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی۔ زیر نظر کتاب میں ذرائع نقل وحمل کے مسلسل ارتقائی سفر سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 82، قیمت: 28 روپے

جنگلات کی کاشت

مصنف: ایس. کونداس / مترجم: مسرت جہاں

جنگل ہمارے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی ندیاں، پہاڑ اور دیگر قدرتی اشیا۔ یہ نہ صرف ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں معاون ہیں بلکہ کئی اہم صنعتوں کا دارومدار بھی ان پر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف جنگلی درختوں اور جنگل سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/24 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم نئی دہلی-110 066

اردو خبر نامہ

سجاد ظہیر یادگاری خطبہ — ''میر صاحب کا زندہ عجائب گھر''

● نئی دہلی، 13 مارچ۔ ''غزلوں سے قطع نظر میر کی دیگر منظومات میں ایسی دنیا آباد ہے جس کی طرف عام طور سے توجہ نہیں دی گئی۔ اس دنیا میں انسان بھی ہیں اور وحوش وطیور بھی۔ میر کا ان سے شغف دراصل اشیا اور انسان کے مختلف مظاہر سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کے باعث ہے اور اس وصف میں اردو کا کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں ہے۔'' ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایڈورڈ سعید ہال میں دوسرے سجاد ظہیر یادگاری خطبے کے دوران جناب شمس الرحمن فاروقی نے کیا۔ خطبے کی صدارت وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے کی۔ ''میر صاحب کا زندہ عجائب گھر'' کے موضوع پر خطبہ پیش کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے مزید کہا کہ ''آب حیات'' سے میر کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ وہ مردم بیزار نہیں تو دنیا بیزار ضرور تھے۔ انھوں نے کہا کہ میر کا تمام معلوم کلام صحیح صورت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی شائع کردہ ''کلیات میر'' میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی ایک جلد شائع ہوگئی ہے، دوسری جلد اشاعت کے مرحلے میں ہے۔

سجاد ظہیر کے بارے میں سرور الہدیٰ نے کہا کہ سجاد ظہیر کو یاد کرنا صرف ادبی معاملہ نہیں، تہذیبی معاملہ بھی ہے کیونکہ ان کا ادبی شعور ہماری مشرقی روایات میں رچا بسا تھا۔ سید شاہد مہدی نے کہا کہ دراصل یہ خطبہ ہمارے کلاسیکی ورثے کی بازیافت ہے چونکہ اب متن پڑھنے کی روایت کمزور ہوتی جارہی ہے، اس لیے ہم اپنے علمی اور ادبی خزانے سے بہت دور ہوتے جارہے ہیں۔ سجاد ظہیر کی بیٹی نور ظہیر نے بطور مہمان اعزازی شرکت کرتے ہوئے سجاد ظہیر کی انسان دوستی اور روشن خیالی کا خاص طور سے ذکر کیا۔

اس سے قبل مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے شمس الرحمن فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کو ماضی اور اس کے شاندار تہذیبی، اخلاقی اور روحانی ورثے کو نئی زندگی دینے سے تعبیر کیا اور کہا کہ ہند اسلامی اقدار اور ثقافت کی بازآفرینی کے ذریعے اردو فکشن کو یہ ایک عظیم سوغات ہے۔ یادگاری خطبے کے کنوینر ڈاکٹر خالد محمود نے کہا کہ میر کی تخلیقی ہمہ جہتی کے جس پہلو پر آج شمس الرحمن فاروقی نے سیر حاصل گفتگو کی ہے، عموماً میر کے ناقدین اسے چھوکر گزر جاتے ہیں۔

اس موقع پر جامعہ کے اساتذہ، طلبہ، ریسرچ اسکالر اور اہم شخصیات موجود تھیں، جن میں خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر مسعود الحق، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، خلیل الرحمن، کمال احمد صدیقی، پروفیسر الطاف اعظمی، پروفیسر مجیب رضوی، ڈاکٹر تابش مہدی، ڈاکٹر ایم. آر. قاسمی، فرحت احساس، فصیح اکمل قادری، ڈاکٹر نگار عظیم، معین شاداب اور محمد ہادی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ آغاز شعبے کے طالب علم ریاض احمد کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

غالب اور عہد حاضر — سیمینار

● نئی دہلی، 24 فروری۔ غالب کسی ایک قوم یا ملک کے نہیں بلکہ عالمی شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا تعلق ہر دور سے رہا ہے اور ان کی شاعری عام آدمی کی زندگی کی ترجمانی کرتی ہے، اس لیے وہ دور حاضر میں بھی مقبول ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے غالب اکیڈمی کے 38ویں یوم تاسیس اور مرزا غالب کے 138ویں یوم وفات کے موقع پر منعقد سہ روزہ تقریبات کے آخری دن غالب اکیڈمی میں ''غالب اور عہد حاضر'' کے عنوان سے منعقد سیمنار میں کیا۔ پروگرام کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شاہد حسین نے کی، جب کہ افتتاح پروفیسر جوگندر پال نے کیا۔ نظامت ڈاکٹر عائشہ سلطانہ نے کی، دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صادق اور پروفیسر ابن کنول نے کی اور نظامت ممتاز عالم نے کی۔

پہلے اور دوسرے اجلاس میں تقریباً 10 مقالے پڑھے گئے۔ اس موقع پر پروفیسر جوگندر پال اور شاہد حسین نے ڈاکٹر عائشہ سلطانہ کی کتاب ''سیتاہرن کا تنقیدی جائزہ'' اور ''مختصر اردو افسانے کا سماجیاتی مطالعہ'' کا اجرا بھی کیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شاہد حسین نے کہا کہ غالب پر 300 سے زیادہ کتابیں لکھی جاچکی ہیں، لیکن پھر بھی غالب پر مزید کام کیے جانے کی ضرورت ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے مرزا غالب اور غالب اکیڈمی کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ہماری کوشش یہی رہے گی کہ اس آفتاب کی روشنی کبھی مدھم نہ ہونے پائے، پروفیسر جوگندر

پال نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ جو لوگ اقبال اور غالب کا موازنہ کرتے ہیں، وہ ان دونوں کے ہی ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔ ادیب کو بڑا یا چھوٹا کہنا بڑی بے معنی بات ہے، کیونکہ ان کی زندگی کا اپنا اپنا تجربہ ہوتا ہے۔

سیمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر صادق اور پروفیسر ابن کنول نے مقالہ نگاروں کے ذریعے پیش کیے گئے مقالوں پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر پروفیسر شمیم حنفی نے ''غالب اور ہمارا عہد'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ''غالب اور عصر حاضر'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ غالبیات کے سرمائے کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ عصر حاضر میں غالب کے متعدد اشعار بار بار مختلف صورتوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر نقی حسین جعفری، مولا بخش، ارجمند آرا، سرورالہدیٰ، شکیل اختر، خالد جاوید اور احمد محفوظ نے بھی اپنے مقالات پیش کیے۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

دہلی کی ادبی تہذیبی اور سماجی زندگی پر سیمینار

● نئی دہلی، 15 فروری۔ 1857 کی بغاوت کے بعد انگریزوں نے صرف دہلی کے باشندوں سے ہی بدلا نہیں لیا بلکہ انھوں نے یہاں کی اینٹوں اور پتھروں سے بھی بدلا لیا۔ انھوں نے تاریخی عمارتوں کو نقصان پہنچایا اور جان بوجھ کر دہلی کی علمی، ادبی اور فنی شخصیات کو نشانہ بنایا جس سے دہلی کی تہذیب کو کافی نقصان ہوا۔ آج پھر اس تہذیب کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے انجمن ترقی اردو (دہلی) کے زیر اہتمام 'یوم غالب' کے موقع پر ''دہلی کی ادبی، تہذیبی اور سماجی زندگی'' کے عنوان سے مزار غالب پر منعقد سیمنار میں کیا۔ اس موقع پر شام غزل کا بھی اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی جب کہ اردو اکادمی (دہلی) کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ پروگرام کا افتتاح خواجہ حسن ثانی نظامی نے کیا اور استقبالیہ تقریر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے کی۔ حیدر اور عقیل احمد نے دہلی کی تہذیب پر مقالے پیش کیے۔ مہمانان خصوصی نے غالب کے مزار پر گلپوشی بھی کی اور فاتحہ پڑھی۔ پروفیسر قمر رئیس نے دہلی کی تہذیب اور ادبی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ دہلی اور ترکی کی تہذیب میں گہرا رشتہ ہے۔ اگر قریب سے دہلی کی تہذیب کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ایک جانب جہاں اس میں گنگا جمنی تہذیب ملتی ہے وہیں اس کی اپنی الگ پہچان بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی کی تہذیب میں وسط ایشیا کی تہذیب کا دخل رہا ہے۔ انھوں نے اپنے دورۂ ترکی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہاں بڑے پیانے پر غالب کو پڑھا اور سمجھا جا رہا ہے اور ان کی تصانیف کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ اگر کسی تہذیب کا ماتم کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا ہمیں دہلی کی تہذیب کو بچانے کے لیے سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے کہا کہ مزار غالب اور دیگر تاریخی مقامات کی حفاظت کے لیے سنجیدگی سے غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے ورنہ ہمارا اور ان کا وہی حشر ہوگا جو لاوارثوں کا ہوتا ہے۔ اس موقع پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی اور دیگر معزز شخصیات نے سرکار سے مطالبہ کیا کہ کسی میٹرو اسٹیشن یا پھر اہم سڑک کا نام غالب کے نام پر رکھا جائے کیونکہ انھوں نے ہندوستانی شاعری کو عالمی سطح پر ایک الگ شناخت دی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ نئی نسل اردو سے واقفیت نہیں رکھتی، نہ تو ان کا تلفظ ہی صحیح ہوتا ہے اور نہ ہی معنی وغیرہ۔ انھوں نے کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں نئی نسل کا کوئی قصور ہے بلکہ وہ محفلیں ختم ہو گئی ہیں جن سے زبان کی اصلاح وتربیت ہوا کرتی تھی، لہٰذا اس سلسلے میں سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر ''شام غزل'' کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں مشہور گلوکار عبدالرحمٰن نے سامعین کو محظوظ کیا۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

غالب میموریل لیکچر

● نئی دہلی، 26 فروری۔ کہانی لکھتے وقت دراصل ہم زبان نہیں کہانی لکھ رہے ہوتے ہیں۔ کہانی میں زبان لکھنے کا اصرار گمراہیاں پیدا کرتا ہے۔ اگر افسانہ نگار کہانی کی بجائے زبان کو خوبصورت بنانے کی کوشش کرے گا تو وہ افسانے کی روح تک نہیں پہنچ سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کے معاصرین کو فکشن کی زبان نہیں آتی تھی۔ ان خیالات کا اظہار معروف افسانہ نگار اور ناول نگار پروفیسر جوگندر پال نے کیا۔ وہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے منعقدہ سالانہ ''غالب میموریل لیکچر'' میں تقریر کر رہے تھے۔ پروفیسر جوگندر پال نے مزید کہا کہ ادب میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ آپ کے اندر ایک تبدیلی لاتے ہیں۔ انھوں نے پہلے پریم چند کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے کہانی اور زبان پر گفتگو کی، اس کے بعد منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت اور قرۃ العین حیدر کا ذکر کیا اور ان کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی۔ اس دور کے بعد انھوں نے اپنے دور کا ذکر کیا اور اس میں خصوصی طور پر رتن سنگھ، انتظار حسین کے حوالے سے زبان اور کہانی پر گفتگو کی آخر میں انھوں نے آج کی نسل کا ذکر کیا اور کہا کہ میرے سامنے اس وقت دسیوں

کہانیاں ایسی ہیں جو صرف اچھی نہیں ہیں بلکہ بہت اچھی ہیں۔ انھوں نے مغرب میں لکھی جانے والی کہانیوں کا بھی ذکر کیا جنھیں ہم اردو کی نئی بستیوں کا نام دیتے ہیں اور کہا کہ مغرب میں لکھے جانے والے افسانے ہماری زبان کو وسعت دے رہے ہیں اور ان کے ذریعے نئے نئے محاورے سامنے آرہے ہیں۔

شکاگو سے تشریف لائے جلسے کے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر ظفر الدین فاروقی نے کہا کہ مغرب میں اس وقت معاشرتی، تہذیبی، مذہبی ادبی اور ثقافتی دنیا میں اتنے نئے مسائل آگئے ہیں کہ جو اردو والوں کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ آج مغرب میں جو زبان لکھی جارہی ہے وہ ظاہر ہے کہ پریم چند اور کرشن چندر والی زبان نہیں ہوسکتی۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے اردو اکادمی کے وائس چیئر مین پروفیسر قمر رئیس نے جوگندر پال کی باتوں کی حمایت کی۔ انھوں نے کہا کہ کہانی یقیناً اپنی زبان لے کر خود آتی ہے اور جس طرح کہانی کے کردار آزادی چاہتے ہیں اسی طرح زبان بھی پوری آزادی چاہتی ہے۔

شروع میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابن کنول نے مہمانوں کا استقبال کیا اور غالب میموریل لیکچر کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اب تک یہاں کئی نامور شخصیات اپنا خطبہ پیش کرچکی ہیں اور مستقبل میں بھی پیش کریں گی۔ اظہار تشکر کے فرائض توقیر احمد خاں نے انجام دیے۔ پروگرام میں پروفیسر شریف قاسمی، پروفیسر صادق، ارتضیٰ کریم اور ڈاکٹر علی جاوید کے علاوہ متعدد اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

پریم چند — حیات، کارنامے پر سیمینار

● کلکتہ، 17 جنوری۔ منشی پریم چند سیمینار میں آج یہاں مقالہ نگاروں نے اردو کے اس عہد ساز ادیب کی شخصیت اور فن کے متعدد گوشوں پر روشنی ڈالی۔ ادبی وثقافتی ادارہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اس سیمینار میں منشی پریم چند کے افسانوں کی تفہیم پر مدلل بحث کے ساتھ ان کے عہد اور مسائل نیز عصر حاضر میں ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شمیم انور کی صدارت میں منعقدہ اس سیمینار میں اپنے خطبۂ استقبالیہ میں ماہر تعلیم پروفیسر سلمان خورشید نے منشی پریم چند کی حیات وخدمات پر جامع تقریر کی اور مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کیا۔ شاہد اقبال نے منشی پریم چند کے افسانے شطرنج کی بازی کا جائزہ پیش کیا۔ پرتگیز چرچ کے فرانسس سنیل روزاریو نے ہندی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ رومانہ علی نے پریم چند کے نمائندہ نسوانی کردار 'آنندی' کے حوالے سے تجزیاتی گفتگو اور محمد شمشیر عالم نے فن سے تفصیلی بحث کی۔ ڈاکٹر دبیر احمد، ڈرامہ نگار ظہیر انور، محمد کاظم، مشتاق احمد، شبانہ نسرین، یاسمین اختر، قاضی عبدالباری اور جاوید رحمانی نے بھی اپنے مقالات پیش کیے۔ شمیم انور نے مسلم انسٹی ٹیوٹ کے اراکین کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار کے کنوینر نعیم انیس نے مہمانوں کا استقبال کیا۔

(روزنامہ "آزاد ہند"، کولکاتا)

علامہ شبلی نعمانی پر سیمینار

● اعظم گڑھ، 25 فروری۔ مولانا شبلی نعمانی کی حیات وخدمات پر شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ میں منعقدہ دو روزہ بین اقوامی سیمینار میں خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے شبلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر افتخار احمد نے کہا کہ شبلی 26 سال کی عمر میں مدرسۃ العلوم کے پروفیسر ہی نہیں تھے بلکہ سرسید کی امیدوں کا مرکز بھی تھے۔ ملت کے تئیں غیر معمولی درد اور جذبے کا احساس ہی شبلی کی اصل شناخت ہے۔ شبلی کی تمام تصنیفات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کے مقبول عام چلن مناظرے کو بدل کر حق کے اثبات اور باطل کے رد کے لیے زمانے کے مطابق ایک مثبت شکل پیدا کردی تھی۔ شباب الدین نے کہا کہ شبلی کی تحریروں میں زمانے اور وقت کے ساتھ رشنی اور طاقت بخشنے کی بے پناہ قوت ہے۔ شبلی کو بار بار یاد کرنا وابستگان شبلی کا فرض کفایہ ہی نہیں بلکہ فرض عین ہے۔

پاکستان کے ممتاز دانش ور پروفیسر ریاض مجید نے بین الاقوامی سیمینار کے افتتاحی خطاب میں کہا کہ علامہ کی تحریریں ملت کے اندر آتش رفتہ کا سراغ دیتی ہیں۔ شبلی کی معنویت اور شبلی شناسی کی کوئی ایک جہت نہیں ہے۔ وہ بہ یک وقت ہمہ رخ اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے افکار ونظریات کی بازگشت ڈیڑھ سو سال بعد بھی قائم ہے۔ ریاض مجید نے کہا کہ علامہ شبلی کا تخلیقی جوہر دردمندی سے عبارت ہے اس لیے ان پر کام کرنے والوں کو ہمیشہ اس وصف کو سامنے رکھنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ دارالمصنفین کا قیام شبلی کا اہم کارنامہ ہے اس اہم موقع پر ضرورت ہے کہ ہم ادارے کی تہذیب نو اور جدید کاری پر بھی غور کریں۔ وقت ہم سے اس کا تقاضہ کر رہا ہے۔ انھوں نے کالج کے تابناک ماضی کے پیش نظر اسے یونی ورسٹی بنائے جانے کا مطالبہ کیا، جس کی حاضرین نے پر زور تائید کی۔ دارالمصنفین کے ڈائرکٹر مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے مولانا شبلی کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی مختلف حیثیتوں کو پیش کیا اور کہا کہ شعر وادب اور تاریخ وثقافت کا جو گہرا رچاؤ مولانا شبلی کے یہاں تھا وہ کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہے۔ مولانا اصلاحی نے کہا کہ شبلی نے اسلام

مخالف طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور ان کے اعتراضات کا نہ صرف یہ کہ مدلل جواب دیا بلکہ کسی بھی طور سے اسلام پر آنچ آنے نہیں دی۔

افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ شبلی مصنف اور مجتہد ہی نہیں تھے بلکہ ایک مجدد بھی تھے۔ انھوں نے افکار و نظریات کی دنیا میں ہمارے سر کو ہمیشہ بلند رکھا۔ انھوں نے اس سال کو ''شعرالعجم'' کی صدی کا سال قرار دیا اور کہا کہ ایران جو کہ ہماری ثقافت اور تہذیب کا نمائندہ ملک ہے بہتر ہوتا کہ وہاں سے ''شعرالعجم'' کے صدی ایڈیشن کی اشاعت اور تقسیم ہوتی۔ انھوں نے شبلی کو عصر حاضر کی دانشوری کے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے تالیوں کی پر زور گڑگڑاہٹ میں شبلی اسٹڈی سینٹر کے قیام کی نہ صرف تجویز پیش کی بلکہ اس کے لیے اپنی طرف سے گراں قدر عطیے کا بھی اعلان کیا۔ فارسی ادبیات کے نامور اسکالر کبیر احمد جائسی نے کہا کہ شبلی نے ادبی، تہذیبی اور شعری روایت کو نہ صرف نئی سمت و رفتار بخشی بلکہ آج بھی ہم انھی خطوط پر چل رہے ہیں جو ہمارے بزرگوں نے قائم کر دیے تھے۔

صدارتی خطاب میں رجب نژاد نے علامہ شبلی کو ایک ایسی شخصیت سے تعبیر کیا جس کے افکار و نظریات سرحدوں اور زبانوں کے پابند نہیں۔ رجب نژاد نے کہا کہ شبلی کی تصنیفات آج کے تناظر میں ہم سے ایک نئی قرأت کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اپنے عہد کے مسائل اور معاملات کے لیے شبلی نے کامیابی کا جو نسخہ ترتیب دیا تھا وہ آج بھی اتنا ہی اہم اور معنویت سے پر ہے۔ دو روزہ بین الاقوامی سیمینار میں کالج کے اساتذہ، طلبہ اور قرب و جوار کے ساتھ ساتھ حکومتی افسران اور عوامی نمائندے بھی شریک تھے۔

(روزنامہ ''قومی آواز''، نئی دہلی)

فراق گورکھپوری پر بین الاقوامی سیمینار

● نئی دہلی، 7 مارچ۔ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی شاعری ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا آئینہ ہے۔ ہندوستانی فضا کی ایک نئی دنیا جس طرح فراق گورکھپوری آباد کرتے ہیں اس طرح کی روایت نہ تو ماضی میں نظر آتی ہے اور نہ ہی فراق گورکھپوری کے معاصرین میں۔ ان خیالات کا اظہار یہاں ساہتیہ اکیڈمی کے زیر اہتمام فراق گورکھپوری سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار میں مقالہ نگاروں اور مقررین نے کیا۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ساہتیہ اکادمی کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ فراق کی شاعری ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن چکی ہے۔ فراق ان شاعروں میں سے ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی لہجہ اردو شاعری میں پہلے بھی تھا، فراق کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے خدائے سخن میر تقی میر کی شعری روایت کے حوالے سے اس کی بازیافت کی اور آج کے انسان کے دل کی دھڑکنوں کو اس میں سمو دیا اور اردو کی عشقیہ شاعری کو ایک آفاقی گونج دی۔ ان کی شاعری میں انسانی تہذیب کی صدیاں بولتی ہیں۔ افتتاحی تقریب میں پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ فراق کے یہاں ایک نئی دنیا خلق ہوتی معلوم ہوتی ہے اور یہ ترقی پسند تحریک کی دین تھی۔ انھوں نے کہا کہ 25 برس گزر جانے کے بعد بھی فراق کے یہاں بہنے والا منہ زور دھارا رواں دواں ہے۔ مگر ہم ان کے ان سرچشموں سے اب بھی دور ہیں جو فراق کو فراق بناتے ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے اپنا کلیدی مقالہ 'فراق کی شاعری کے آفاق' پیش کرتے ہوئے کہا کہ فراق دیدہ ور اور ذی علم شخصیت کا نام ہے۔ فراق کی جمالیات میں عشق پہلا اور آخری سبق ہے۔ وہ جنسی رنگ کو جمالیاتی رنگ دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور انھوں نے عشق و عاشقی کی ایک نئی روایت قائم کی۔ فراق میر سے متاثر ہونے کے باوجود ان کی تقلید نہیں کرتے۔ ان کے عشق میں دل کے ساتھ ساتھ ذہن بھی متحرک نظر آتا ہے۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر سید تقی حیدر عابدی نے کہا کہ فراق کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے کلام کو کلیات کی شکل دی جائے۔ سیمینار کے دوسرے اجلاس میں دو مقالے پیش کیے گئے۔ صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر شاہد مہدی نے کی۔ پہلا مقالہ پیش کرتے ہوئے ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ فراق گورکھپوری کے یہاں معنی آفرینی بہت نمایاں تو نہیں ہے لیکن گاہے بہ گاہے ان کے یہاں یہ خصوصیت نظر ضرور آتی ہے۔ ان کے یہاں کیفیت کے اشعار کی فراوانی ہے جس نے فراق کو غیر معمولی مقبولیت عطا کی۔ دوسرا مقالہ آفاق احمد نے پیش کیا اور کہا کہ فراق مکتبی انداز میں پڑھنے اور سمجھنے والے شاعر نہیں ہیں۔ تیسرے اجلاس میں دو مقالے پیش کیے گئے۔ صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ پہلا مقالہ پروفیسر علی احمد فاطمی نے پیش کیا اور فراق گورکھپوری کی سیاسی زندگی پر روشنی ڈالی۔ دوسرا مقالہ پروفیسر قدوس جاوید نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ فراق کی غزل نے یہ تاثر بھی دیا کہ ہندوستان محض جغرافیائی حدود کا ہی نام نہیں بلکہ ایک فلسفہ، ایک تہذیب اور ایک طرز معاشرت کا بھی نام ہے۔ چوتھے اجلاس میں تین مقالے پیش کیے گئے۔ صدارت بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان (پاکستان) کے ڈین پروفیسر انوار احمد نے کی۔ مقالات سلیمان اطہر جاوید، ف س اعجاز اور سیفی سرونجی نے پیش کیے۔

دوسرے اجلاس میں جو مقالے پڑھے گئے ان میں پاکستان کے نوجوان ناقد ڈاکٹر قاضی عابد بھی تھے۔ انھوں نے کہا کہ فراق گورکھپوری مابعد جدید دور میں ایک نہیں بلکہ کئی بڑے ناقدین کے منتظر ہیں۔ آج کے ادبی منظر نامے میں ناقدین کو فراق پرستوں اور فراق مخالفوں کی دھند سے نکلنا ہوگا اور فراق کی قدر و قیمت کے لیے غیر جانبدارانہ تنقیدی رویے کو تقویت پہنچانی ہوگی تبھی ہم فراق شناسی کا حق ادا کر سکیں گے۔ انھوں نے مابعد جدیدیت کے حوالے سے کہا کہ تجرید اور تجسیم کے درمیان فراق کی رباعیاں ایک پل بنانے کا کام کرتی ہے۔ خالد محمود نے کہا کہ فراق کے یہاں تشبیہوں میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے سوال اٹھایا کہ آخر فراق کے یہاں آدھی ادھوری عورت کیوں پیش کی گئی۔ شہزاد انجم نے ان کی رباعیوں کے حوالے سے کہا کہ فراق نے اپنی رباعیوں میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بڑی خوبی سے استعمال کیے ہیں۔ فراق کے یہاں عورت صرف حسن کی جلوہ گری نہیں بلکہ ماں، بیٹی اور بہن بن کر بھی سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ فراق نے اردو رباعی کو ایک نیا رخ دیا ہے۔ فراق کی رباعی میں نہ تو سو فیصد شرنگار رس ہے نہ ہی سو فیصد آریائی جمالیات اور نہ ہی مغربیت بلکہ ان کا اپنا منفرد انداز اور شعری جمالیات ہے۔ اجے مان سنگھ، نعمان خاں، پروفیسر علی احمد فاطمی، ابوالکلام قاسمی، فرحت احساس اور ڈاکٹر رئیس احمد نے کئی اہم سوالات کیے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نتیجۂ بحث پیش کرتے ہوئے کہا کہ سیمینار میں بہت سے ایسے نکات ابھر کر سامنے آئے ہیں جن سے فراق کی افہام و تفہیم کے نئے در وا ہوتے ہیں اور سیمینار کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم فراق کو از سر نو دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ چھٹے اجلاس میں تین مقالے پیش کیے گئے۔ صدارت پروفیسر صادق نے کی۔ ڈاکٹر مولا بخش نے اپنا مقالہ 'فراق کا اسلوبی مزاج' پیش کیا۔ نظام صدیقی نے اپنے مقالے میں کہا کہ فراق گورکھپوری کلاسیکی غزل کے آخری اور جدید غزل کے پہلے شاعر ہیں۔

اس سہ روزہ انٹرنیشنل سیمینار کے آخری دن ایک طرحی شعری نشست کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے کی۔ شعرا نے اس نشست میں فراق کی مختلف غزلوں کی زمینوں میں اپنی غزلیں پیش کیں، یہ اپنے انداز کی ایک منفرد نشست تھی۔ گلزار دہلوی نے فراق گورکھپوری کے کئی دلچسپ واقعات سنائے۔ نشست کے آخر میں تمام مندوبین اور شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ساہتیہ اکیڈمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج کے اس شعری جلسے میں پانچ ایسے شعرا بھی شامل ہیں جنھیں ساہتیہ اکادمی کے ادبی ایوارڈ سے سرفراز کیا جا چکا ہے۔ شعری نشست کے منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے:

راز مشیت کوئی نہ سمجھا
اس کی قدرت خیر سے شر تک

گلزار دہلوی

زبانیں کاٹ کر بھی مانگتے ہیں وہ بیاں اب تک
نتیجہ تو نکل آیا مگر ہے امتحاں اب تک

مظہر امام

وقت تیری یہ ادا میں آج تک سمجھا نہیں
میری دنیا کیوں بدل دی مجھ کو کیوں بدلا نہیں

شہریار

آج اس شعلہ صفت آواز کی باتیں کرو
جو مجسم سوز ہے اس ساز کی باتیں کرو

بلراج کومل

میری محویت تنہائی تو دیکھ
تو بھی آ جائے تو گھبرا جاؤں

مخمور سعیدی

نہ جانے کیسے برابر ہوئے محبت میں
ہزار خواہشیں میری، تمھاری ایک نہیں

شین کاف نظام

بات تو جب ہے کہ لادیں زندگی میں انقلاب
تیری یہ مخمور آنکھیں تیرا یہ رنگ شباب

کوثر صدیقی

راس آیا اس قدر ہم کو سرابوں کا سفر
بھول کر بھی جانب دریا کبھی دیکھا نہیں

ہمایوں ظفر زیدی

آج وہ ساتھ نہیں ہے تو ابھی راہوں پر
دیکھتا ہوں تو درختوں کا وہ سایہ بھی نہیں

فرحت احساس

جنھیں بھلانے میں اک عمر اپنی بیت گئی
ہر ایک موڑ پر وہ یاد آئے ہیں کیا کیا

شاہد ماہلی

زندگی کیا ہے کیوں ہے کیسے ہے
چند ایسے بھی تجربات کریں

اسد رضا

بے وفائی کا گلہ اس کی، نہ کیجیے ہم سے
اس کے بارے میں کبھی ہم نے یہ سوچا بھی نہیں

متین امروہوی

(روزنامہ ''قومی آواز''، نئی دہلی)

مجاز کی 50ویں برسی

● علی گڑھ، 8 فروری۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ترانے کے خالق اور ترقی پسند تحریک کے ممتاز شاعر مجاز کی 50ویں برسی کے موقع پر انجمن ترقی پسند مصنفین نے یونیورسٹی کے اسٹاف کلب میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ جلسے میں بحیثیت مہمان خصوصی مجاز کی بہن حمیدہ سالم نے شرکت کی۔ جب کہ ممتاز ڈرامہ نگار محمد مہدی نے جلسے کی صدارت کی۔ حمیدہ سالم نے نہایت جذباتی انداز میں بیان کیا کہ مجاز کو کس قسم کی دشواریوں، مشکلات اور غموں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے کہا کہ مجاز نہایت حساس شاعر تھے اور ان کی شاعری میں عوامی درد کی جھلک صاف طور پر ملتی ہے۔ اس سے قبل جلسے کا آغاز ڈاکٹر عارف ایچ رضوی نے مجاز کی ایک نظم پڑھ کر کیا۔ اس کے بعد سراج اجملی نے مجاز کی زندگی اور شاعری پر مقالہ پیش کیا۔ سیع رفیقی نے مجاز اور انگریزی کے شاعر جان لیٹس کی شاعری کا تقابلی جائزہ پیش کیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں مجاز کے دوست محمد مہدی نے مجاز کی شخصیت اور ان کے تئیں عوامی رجحان پر روشنی ڈالی۔ جلسے میں مطالبہ کیا گیا کہ یونیورسٹی میں مجاز کے نام سے کوئی ادارہ قائم کیا جانا چاہیے اور ان کی یاد میں ہر سال پروگرام منعقد کرایا جانا چاہیے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر تصدق حسین نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی)

حسن نعیم کی شخصیت اور شاعری پر سیمینار

● پٹنہ، 21 فروری۔ خدا بخش لائبریری میں اردو کے نامور شاعر حسن نعیم کی یاد میں ایک دو روزہ سیمینار ''حسن نعیم: شخصیت اور فن'' کے موضوع پر منعقد ہوا۔ جس کا افتتاح 21 فروری کی صبح گیارہ بجے خدا بخش لائبریری کے آڈیٹوریم میں ہوا۔ ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے مہمانان خصوصی، مندوبین اور سامعین کا استقبال کیا۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے حسن نعیم پر لائبریری سے شائع شدہ ایک کتاب ''نقوش حسن'' کا اجرا کیا اور اپنے ارشادات سے نوازا۔ پروفیسر عتیق اللہ، وزیٹنگ پروفیسر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر کلیم احمد عاجز اور ڈاکٹر سلیم الدین احمد نے مندوبین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر امتیاز احمد نے کہا کہ عصری اردو شاعری میں حسن نعیم کا نام ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس سیمینار میں ملک کے مختلف حصوں سے مشہور اور معتبر محقق ادیب اور نقاد حصہ لے رہے ہیں اور صوبۂ بہار کی بھی کئی اہم شخصیتیں اس میں شامل ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے ''نقوش حسن'' کا اجرا کرتے ہوئے فرمایا کہ نقوش حسن ایک دستاویزی کتاب ہے۔ اس سے حسن نعیم کو سمجھنے میں سہولت ہوگی مزید کہا کہ حسن نعیم بڑے اصول پسند آدمی تھے کسی سے دبتے نہیں تھے۔ جب ان کے ایک ماتحت کو ترقی دے کر ان سے اونچا عہدہ دے دیا گیا تو انھوں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ حسن نعیم ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اپنے دشمن آپ تھے۔ اپنی جائداد انھوں نے اونے پونے میں لٹا دی۔ حسن نعیم کی شاعری پر جب محمود ہاشمی نے اعتراضات کیے تو حسن نعیم نے کہا ''میں خودکشی کرلوں گا'' لیکن میں نے انھیں اطمینان دلایا کہ ان اعتراضات کا جواب میں دوں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ وہ اپنے انداز کے منفرد شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں منطقی ربط تھا۔ ان کے ان اشعار کا بدل آپ اردو ادب میں ڈھونڈ ھیے نہیں ملے گا۔

بام خورشید سے اترے کہ نہ اترے کوئی صبح
خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے
وحشت سرائے ذہن میں وہ بھی تھا اجنبی
دل میں رہا مقیم تو اپنے مکاں میں تھا

پروفیسر عتیق اللہ نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ حسن نعیم کی شاعری پر محمود ہاشمی کے اعتراضات تجزیہ طلب ہیں۔ شہریار، بانی، خلیل الرحمٰن اعظمی، ظفر اقبال، مجید امجد، اختر الایمان وغیرہ کی طرح حسن نعیم کسی خاص زمرے میں نہیں رکھے جاسکتے۔ حسن نعیم اپنی روش پر آخر تک قائم رہے۔ میر، غالب، نظیر اکبرآبادی کی طرح حسن نعیم نے اپنے عہد میں نئی راہ اختیار کی وہ بڑے حق گو تھے، روبرو کہنے کے عادی تھے۔ پس پشت کہنے کے قائل نہیں تھے۔ جہاں تک انا کا تعلق ہے۔ اسے تو ہر دور میں شعرا نے اپنائے رکھا ہے۔ فراق کے اندر بھی انا تھی۔ اسی طرح حسن نعیم میں بھی انا تھی۔ حسن نعیم نے نئے محاورے نئے مکالمے، نئے الفاظ بہت خوبصورتی سے استعمال کیے، ترقی پسند شعرا کا جس وقت طوطی بول رہا تھا اس وقت حسن نعیم نے اپنی پہچان بنائی۔

احمد یوسف نے حسن نعیم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ میرے ان کے تعلقات 70 سال پر محیط ہیں۔ ان کے خطوط جو میرے نام ہیں ان کی تعداد ساڑھے تین سو سے زائد ہے۔ حسن نعیم جو شعر کہتے تھے اس کے متعلق بار بار سوچتے تھے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں جابجا دوستوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح وطن دوستی کی مثال بھی ان کی شاعری میں جابجا ملتی ہے۔ پروفیسر کلیم عاجز نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ حسن نعیم کا نام میں نے سنا تھا، جب ان سے ملا تو ان ہی کا ہو کر رہ گیا۔ ان کا ایک شعر ہے:

جاگے تمام عمر کہ ہر سو نگاہ تھی
دنیا مرے حبیب کی آرام گاہ تھی

حسن نعیم نے پوری دنیا کو اپنے محبوب کی آغوش میں ڈال دیا۔ دنیا کو اس نے اپنے محبوب کی آرام گاہ بنا دیا۔ حسن نعیم کی شاعری میں میری اپنی شاعری نظر آتی ہے۔ جس طرح میں اپنی شاعری سے پیار کرتا ہوں اسی طرح حسن نعیم سے بھی پیار کرتا ہوں۔ وہ بڑے غیور آدمی تھے۔ ان کی شاعری اور شخصیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔

صدارتی خطبے کے بعد ڈاکٹر سلیم الدین احمد اسسٹنٹ ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے مہمانوں اور مندوبین و سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد سیمینار کے دو اجلاس ہوئے۔ پہلے اجلاس کی نظامت جناب عبدالصمد نے کی اور صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی۔ پہلے اجلاس میں دو مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی (الہ آباد) نے ''روشنی کا شاعر حسن نعیم'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ اس کے بعد جناب احمد یوسف نے اپنا تاثراتی مقالہ پیش کیا۔ احمد یوسف کے مقالے کا عنوان تھا ''جھک کے تعظیم سے شہزادۂ ایام ملا''

دوسرے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اور صدارت پروفیسر بیگ احساس نے کی۔ جناب شفیع جاوید، ڈاکٹر عبدالصمد، جناب شمیم فاروقی اور ڈاکٹر رضوان احمد نے اپنے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کے اجلاسوں کے بعد شام 6.30 بجے محفل موسیقی کا انعقاد ہوا جس میں لکھنؤ کے آرٹسٹ روی ناگر اور ان کے رفقا نے ساز پر حسن نعیم کی غزلیں پیش کیں۔

تیسرے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اور صدارت ڈاکٹر کلیم احمد عاجز نے کی۔ اس اجلاس کے مقالہ نگاروں میں پروفیسر بیگ احساس (حیدرآباد) نے حسن نعیم کی غزل گوئی پر مقالہ پیش کیا، پروفیسر اسلم آزاد نے ''نئی غزل میں حسن نعیم کی انفرادیت'' پر مقالہ پیش کیا، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی (علی گڑھ) نے ''غزل گوئی کی کلاسیکی روایت اور حسن نعیم کی انفرادیت'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (پٹنہ) نے ''حسن نعیم کی خود پسندی'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ چوتھے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر امتیاز احمد نے اور صدارت ابوالکلام قاسمی نے کی۔ اس میں پروفیسر محمد مثنیٰ رضوی نے ''حسن نعیم جدید غزل کی ایک منفرد آواز'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ جناب صدیق مجیبی (رانچی) نے ''حسن نعیم کی شاعری: چند نکات'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر علیم اللہ حالی (گیا) نے حسن نعیم کی انفرادیت'' اور جناب شان الرحمٰن نے ''حسن نامہ'' کے عنوان سے اپنے مقالے پیش کیے۔ پانچویں اجلاس کی نظامت بھی ڈاکٹر امتیاز احمد نے اور صدارت پروفیسر علیم اللہ حالی نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر احمد کفیل (دہلی) نے ''حسن نعیم: فکر، فن اور قاری'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا، جناب امتیاز احمد (علی گڑھ) نے ''حسن نعیم کی شاعری اور آج کے قاری کا مسئلہ'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں (مظفر پور) نے ''حسن نعیم کی غزل گوئی'' اور ڈاکٹر محسن رضا رضوی (پٹنہ) نے ''حسن نعیم کے شعری امتیازات'' کے موضوع پر اپنے مقالے پیش کیے۔

یہ دو روزہ سیمینار مجموعی طور پر کامیاب رہا۔ اس میں جو مقالات پیش کیے گئے اور جو بحثیں ہوئیں ان سے حسن نعیم کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشے اجاگر ہوئے۔ حسن نعیم کی شاعری اوپر سے نہیں اندر سے نئی لگتی ہے، رومانی اشعار میں بھی حسن نعیم کے یہاں تقدس کا احساس ہوتا ہے۔ فکر کی سبک خرامی اور اظہار کی نرم روی حسن نعیم کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ سیمینار

کے اختتام پر ڈاکٹر امتیاز احمد نے سیمینار کے مندوبین اور حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ دوروزہ قومی سیمینار اختتام پذیر ہوا۔

(روزنامہ ''قومی تنظیم''، پٹنہ)

''معاصر اردو نظم: سمت و رفتار'' سہ روزہ سیمینار

● نئی دہلی، 23 فروری۔ بڑی نظم کہنے کے لیے بڑے کینوس کی ضرورت ہوتی ہے اور آج کے عہد میں نظم کا کوئی بڑا شاعر نہیں مل پا رہا۔ ان خیالات کا اظہار برصغیر کے مشہور و معروف شاعر احمد فراز نے آج اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں ''معاصر اردو نظم: سمت و رفتار'' کے عنوان سے منعقد ہونے والے سہ روزہ کل ہند سیمینار کے افتتاحی اجلاس کے دوران کیا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر مشیر الحسن نے کی اور نظامت پروفیسر شاہد حسین نے کی۔ سیمینار کا افتتاح پروفیسر محمد حسن نے کیا۔ احمد فراز نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ ہر بڑا شاعر اپنی لغت ساتھ لاتا ہے۔ یہی بڑے شاعر کی پہچان ہوتی ہے اور غالب اور اقبال اس کی سب سے بڑی مثالیں ہیں۔ ان دونوں کا ڈکشن ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے اپنی افتتاحی تقریر میں نظم کی تاریخ، اردو ادب میں اس کی اہمیت و افادیت اور مستقبل میں اس کے امکانات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے نظم کے تقریباً ڈیڑھ سو سالہ سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے نظم کے کامیاب شعرا کا ذکر ان کی نظموں کے حوالے سے کیا۔

زبیر رضوی نے کہا کہ نظم کے بغیر اردو شاعری کی پہچان ممکن نہیں ہے۔ یہ بات قابل ستائش ہے کہ آج قاری نثری نظم کو قبول کر رہے ہیں پھر بھی نظم کو اپنے لیے قاری تیار کرنے ہوں گے کیوں کہ غزل اور نظم کے قارئین مختلف ہیں۔ مہمان خصوصی کے طور پر شریک شکاگو کے معروف ادیب اور سائنس داں ڈاکٹر ایم مظفر الدین فاروقی نے اردو ادب اور شاعری کے حوالے سے امریکہ میں ہونے والے کاموں کا جائزہ پیش کیا اور بتایا کہ وہاں اردو زبان و ادب کو زندہ رکھنے کے لیے عملی طور پر کیا اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ اس سے قبل اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے اکادمی کی سرگرمیوں سے واقف کراتے ہوئے نظم کی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اس کے ارتقا میں ترقی پسندوں کے رول کا ذکر کیا۔ آخر میں اکادمی کے سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی)

1857 کی بغاوت اور تحریک آزادی پر سیمینار

● نئی دہلی، 22 فروری۔ 1857 کی بغاوت کے دوران شمالی ہند کے ادبی منظر نامے کا ذکر کرتے ہوئے ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اس وقت ملک کے عوام میں برطانوی سامراجیت کے خلاف بیداری اور وطن پرستی کے جذبات کو ابھارنے میں اردو کے صحافیوں اور شاعروں نے اہم ترین رول ادا کیا۔ خاص طور سے غزل نے عوام کے دلوں کی ترجمانی نہایت موثر طریقے سے کی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ 1857 کی بغاوت، سامراجیت، ادب اور تحریک آزادی کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں صدارتی خطبہ پیش کر رہے تھے۔ پروفیسر نارنگ نے مزید کہا کہ اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب نے 1857 کے دوران برطانوی حکومت اور انگریز فوجیوں کی زیادتیوں اور مظالم کو اپنے خطوط میں نہایت بے باکی سے اجاگر کیا ہے۔ 1857 کی بغاوت نے ایک ایسا ماحول تیار کر دیا تھا جو آگے چل کر جنگ آزادی کی راہ میں مشعل بنا۔ ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ تحریک آزادی کے دوران ایک بڑا ہتھیار ثابت ہوا۔ سیمینار میں مہمان خصوصی ممتاز مورخ پروفیسر عرفان حبیب نے کئی غور طلب نکات اٹھائے۔ انھوں نے توجہ دلائی کہ بغاوت کرنے والوں میں زیادہ تعداد بنگال آرمی کے جوانوں کی تھی۔ اس بغاوت کی ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لوگوں نے علم بغاوت ایک ساتھ بلند کیا۔ ممتاز دانشور اور صحافی وید پرتاپ ویدک نے کہا کہ بلاشبہ 1857 کی بغاوت ہندوستان کی آزادی کی پہلی جنگ تھی۔ اس جنگ کا سبب گائے اور سور کی چربی والے کارتوس نہیں تھے اور نہ یہ دین دھرم کا معاملہ تھا یہ تو 1757 میں ہوئی پلاسی کی جنگ سے لے کر 1857 تک یعنی پورے سو برس تک لگاتار استحصال کا ردعمل تھا۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ 10 مئی 1857 سے بہت پہلے سے ہی سلگ رہی تھی۔ اس سے پہلے ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری مسٹر اے. کرشنا مورتی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت آشیش نندی نے کی، پرشوتم اگروال، ورشا داس اور کے. چیلپن نے اپنے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر ورشا داس نے 1857 کو روایت پسند ہندوستانی برادری اور جدید برطانوی سرمایہ داروں کے درمیان کشمکش کا نتیجہ بتایا تو پرشوتم اگروال نے ممتاز مورخ ایم. این. رائے کے حوالے سے کہا کہ یہ بغاوت درحقیقت سماجی ردعمل کے طاقتور خیالات اور جذبات سے پیدا ہوئی

تھی۔ درحقیقت یہ بغاوت انگریزی سرکار کے خلاف نہ ہو کر اس حکومت کی طرف سے پیش کیے گئے ترقی پسندانہ سماجی اور سیاسی افکار و خیالات کے خلاف تھی۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی)

کسی زبان کو دوسری زبان پر فوقیت حاصل نہیں

● نئی دہلی، 9 مارچ۔ ساری زبانیں انسانوں نے اپنے ذریعۂ اظہار کے طور پر ایجاد کی ہیں اور کسی زبان کو کسی دوسری زبان پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ ان خیالات کا اظہار آج یہاں امریکہ میں سکونت پذیر ہندوستانی ڈاکٹر اور ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالجمیل خاں نے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام اپنی انگریزی کتاب ''اردو ہندی این آرٹیفیشیل ڈیوائڈ (اردو ہندی: مصنوعی تقسیم) پر مذاکرے کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی ایک ہی زبان ہیں، مگر برسوں کے لسانی تعصبات نے مصنوعی دیواریں کھینچ رکھی ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کی بنیاد بن گئی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس تقسیم کو ختم کرکے ان زبانوں کی لسانی وحدت کی بازیابی کے لیے کوشش کی جائے، جس سے ہندو مسلم اتحاد کو بھی فروغ ملے گا۔

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر اختر الواسع نے مہمان دانشور کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر خان کی یہ کتاب لسانی و تہذیبی وحدت سازی کے عمل کو فروغ دینے کی ایک نہایت مثبت اور انقلابی کوشش ہے، جسے ایک مہم کی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب ایک ایسے وقت پر شائع ہوئی ہے جب پروفیسر گیان چند جین کی کتاب ''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب'' کی اشاعت نے اردو ہندی اختلافات کی ٹھنڈی آگ کو نئے سرے سے بھڑکا دیا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ عبدالجمیل کی کتاب کے ذریعے اردو اور ہندی سے متعلق تعصبات اور ذہنی جالوں کو مٹانے میں مدد ملے گی۔ فرحت احساس نے کہا کہ یہ کتاب جذبۂ عشق کے ساتھ لکھی گئی ہے، اس لیے اس میں زبردست قوت شفا پیدا ہو گئی ہے۔ معروف اسکالر اور صحافی ڈی آر. گوئیل نے زبان کی سیاست اور برطانوی دور میں اس کی بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو بانٹنے کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب اور اس مصنف کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اس کتاب کو ہندوستان کی تہذیبی تعمیر نو کی ایک مہم کی شکل دی جانی چاہیے۔ جلسے میں ڈاکٹر اقتدار محمد خاں، ڈاکٹر فریدہ خانم، ڈاکٹر شاہد علی خاں، ڈاکٹر محمد ارشد، ذہین اختر، نجم السحر ثاقب، عمر فاروق، خالد عمری، راشد احمد کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ، ریسرچ اسکالر اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی)

اردو کو روزگار سے جوڑنا وقت کی اہم ضرورت

● نئی دہلی، 26 فروری۔ اردو رابطے کی زبان ہے، بول چال کی زبان ہے لیکن یہ روزگار سے جڑی ہوئی زبان نہیں ہے۔ اس لیے اگر اردو کے مستقبل کو تابناک بنانا ہے تو اسے روزگار سے جوڑنا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار آج اردو اکادمی دہلی میں اپنی استقبالیہ تقریب کے دوران پاکستان سے آئے ممتاز صحافیوں کے وفد کے اراکین نے کیا۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس، سندھی اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ایم. کے. جیٹلی اور اردو اکادمی کے سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے پاکستانی وفد کے اراکین کا استقبال کیا۔

پاکستانی صحافیوں کے وفد کی قیادت کر رہے ''دی نیوز'' کے بیورو چیف بہروز خاں نے ایک سوال کے جواب میں یہ تسلیم کیا کہ آئندہ نسل میں اردو کے قارئین کی تعداد میں کمی آنے کا خدشہ ہے کیونکہ وہ انگریزی کی جانب بھاگ رہی ہے۔ انگریزی روزگار سے جڑی ہوئی زبان ہے جب کہ اردو ابھی تک روزگار سے نہیں جڑ پائی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان میں اردو رابطے کی زبان ہے اس کے علاوہ ٹی.وی.، ریڈیو، اخبارات اور رسائل کی زبان بھی اردو ہے لیکن اس کی بقا کے لیے اسے روزگار سے جوڑنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں وفد کے دیگر اراکین ''ڈان'' اسلام آباد کے ناصر اقبال اور ''دی نیشن'' کے اسٹاف رپورٹر خالد خاں خیشگی نے کہا کہ پاکستان میں صحافت کافی حد تک آزاد ہے اور فوجی حکومت کے باوجود دیگر اپوزیشن پارٹیوں کی حمایت اور تعاون میڈیا کو ملتا رہتا ہے اور صحافی عوام سے جڑے ایشوز پوری شدت کے ساتھ اٹھاتے ہیں۔ ناصر اقبال نے کہا کہ پاکستانی میڈیا مسلسل جدوجہد کر رہی ہے۔ وفد کے دیگر اراکین نے بات چیت کے دوران پاکستانی صحافت کو درپیش مسائل کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ وہاں ویج بورڈ تو قائم ہوتے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں ہوتا۔ عدالت عالیہ نے تو فیصلہ دے دیا لیکن حکومت اس پر عمل نہیں کر رہی۔

اردو اور سندھی اکادمی کے ممبران کی جانب سے بھی کچھ سوالات اٹھائے

گئے جن کے جواب میں مہمان صحافیوں کا کہنا تھا کہ اردو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک پل کا کام کرسکتی ہے۔ انھوں نے اس بات کی تائید کی کہ دونوں ملکوں کے اخبارات و رسائل کو ایک دوسرے کے یہاں جانے کی آزادی ملنی چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ دونوں ہی ملکوں کی حکومتیں اس معاملے میں رخنہ ڈالنے کے لیے ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دونوں ملکوں کے عوام قریب آنا چاہتے ہیں، ایک دوسرے کو سمجھنا چاہتے ہیں لیکن یہ حکومتیں ہی ہیں جو انھیں قریب نہیں آنے دے رہی ہیں۔

اس سے قبل اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے اپنے استقبالیہ کلمات میں مہمان صحافیوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ زبان اور ثقافت کو مذاہب میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں ملکوں کے درمیان ادیبوں، صحافیوں، دانشوروں اور اساتذہ کا تبادلہ ہوتے رہنا چاہیے اس سے دونوں ملکوں کے تعلقات کو ایک نئی جہت ملے گی اور باہمی اتحاد و محبت کے رشتوں کو جلا حاصل ہوگی۔ انھوں نے مہمان صحافیوں کو اردو اکادمی دہلی کے اغراض و مقاصد، اس کی کارگزاریوں اور سرگرمیوں سے واقف کرایا اور دہلی والوں کی جانب سے ان سب کا استقبال کیا۔ اس وفد میں روزنامہ 'اوصاف' (پشاور) کے بیورو چیف فرید اللہ، پشاور میں روزنامہ 'جنگ' کے نمائندہ گوہر علی، روزنامہ 'صبح' (پشاور) کے چیف رپورٹر محمد نثار، روزنامہ 'آج' کے سب ایڈیٹر احتشام الحق اور اسلام آباد نیوز نیٹ ورک انٹرنیشنل کے ایڈیٹر طاہر محمد خاں بھی موجود تھے۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی)

اردو کا مسئلہ سیاسی بھی جذباتی بھی

● ممبئی، 26 فروری۔ ہندوستان میں اردو کا مسئلہ سیاسی بھی ہے اور جذباتی بھی۔ ملک کے مسلمان اسے جان کی طرح عزیز رکھتے ہیں جب کہ ہندوؤں نے اسے ترک کر دیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز صحافی کلدیپ نیر نے شعبۂ اردو کی جانب سے ممبئی یونیورسٹی کے ڈیڑھ سو سالہ جشن کے موقع پر منعقدہ سہ روزہ کانفرنس کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان رابطے کے کام کو بہ حسن و خوبی انجام دے سکتی ہے۔ ایک تو اس کی شیرینی اور دوسرے اس کا اپنا سیکولر کردار'' عصر حاضر میں ہندو پاک کے آپسی تعلقات اور زبان و ادب کی مشترکہ تہذیبی میراث'' کے موضوع پر منعقدہ اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ملک کا مسلمان ہر روز ملک کی تقسیم کی قیمت چکا رہا ہے نیز ان کی زندگی ان دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات و روابط کو بڑھانے اور ہندوؤں و مسلمانوں کے مابین خوشگوار رشتے استوار کرنے کی کوشش سے عبارت ہے۔

شعبۂ اردو کو کانفرنس کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے جناب کلدیپ نیر نے کہا کہ ان کی معلومات کے مطابق پورے عالم میں کسی بھی یونیورسٹی میں اس موضوع پر آج تک کوئی سیمینار یا کانفرنس منعقد نہیں ہوئی۔ کانفرنس کے دوسرے اجلاس کی صدارت پاکستان سے آئے ممتاز افسانہ نگار انتظار حسین نے کی اس اجلاس میں جناب اسد الدین، عبد الحق اور افضال حسین نے بھی اپنے مقالات پیش کیے۔

(روزنامہ ''قومی آواز''، نئی دہلی)

دو روزہ کل راجستھان اردو سیمینار

● راجستھان، 4 مارچ۔ راجستھان اردو اکادمی اور اے. پی. آر. آئی. ٹونک کے تعاون و اشتراک سے بزم تاریخ و تحقیق ٹونک کے زیر اہتمام دو روزہ اردو سیمینار 28-27 فروری 2007 کو مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک، راجستھان میں منعقد ہوا۔ سیمینار کا موضوع تھا۔ '' راجستھان میں اردو تعلیم و تحقیق آزادی کے بعد'' (عربی و فارسی کے ضمنی حوالے کے ساتھ)۔

سیمینار کا افتتاح راجستھان مدرسہ بورڈ کے چیئرمین جناب ہدایت علی خاں دھولیہ نے کیا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت صاحبزادہ شوکت علی خاں نے کی۔ راجستھان اردو اکادمی کی چیئرپرسن ڈاکٹر پروین اختر صاحبہ نے استقبالیہ تقریر کی۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب عبدالمعید خاں نے دھولیہ صاحب کو مومنٹو پیش کیا۔ بزم کے صدر ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے سیمینار کے انعقاد پر روشنی ڈالی۔ جناب اوم پرکاش گپتا میڈیا پربھاری ٹونک، ہدایت علی خاں دھولیہ اور صاحبزادہ شوکت علی خاں نے خطاب کیا اور ارشد عبدالحمید نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

سیمینار کا پہلا اجلاس 3 بجے ڈاکٹر حبیب الرحمن نیازی (اجمیر) کی صدارت میں شروع ہوا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر پروین اختر تھیں ڈاکٹر عمر جہاں نے نظامت کی اور مندرجہ ذیل حضرات نے مقالے پڑھے:

ڈاکٹر حبیب الرحمن نیازی۔ راجستھان میں یونیورسٹی اور کالج سطح پر اردو

تحقیق،سید معقول احمد (ٹونک) ڈائٹ میں اردو تعلیم،ڈاکٹر قمر جہاں (کوٹہ) کوٹہ میں اردو تعلیم،سمت و رفتار،ڈاکٹر ریاض الدین خاں، (ٹونک) اردو تحقیق اے.پی.آر.آئی. کے حوالے سے،ڈاکٹر غلام آسی (اودے پور) سکھاڑیہ یونیورسٹی میں اردو تحقیق، پروین بانو (اودے پور) اودے پور میں اردو تعلیم،سنیتا چاولہ (ٹونک) غیر مادری زبان کے طلبہ و طالبات کی اردو تعلیم۔

سیمینار کے دوسرے دن دوسرا اجلاس صبح 10 بجے شروع ہوا۔ پریسیڈیم میں ڈاکٹر پروین اختر،شوکت علی خاں، ڈاکٹر عمر جہاں اور محمد صادق بہار شامل تھے۔ بزم تاریخ و تحقیق کے سکریٹری ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے نظامت کی۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل حضرات نے مقالے پڑھے:

مولانا محمد عمر ندوی (ٹونک)۔۔۔ راجستھان میں عربی فارسی کی تعلیم و تحقیق،محمد شاہد پٹھان (جے پور)۔۔۔ راجستھان یونیورسٹی میں اردو تحقیق،ڈاکٹر عمر جہاں ۔۔۔ خواتین کی اعلیٰ اردو تعلیم،ڈاکٹر ریاض الدین انصاری (بوندی)۔۔۔ ضلع بوندی میں اردو زبان کی تعلیم،ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی (ٹونک)۔۔۔ راجستھان میں اردو میڈیم اسکولوں کی صورت حال اور بنیادی مسائل،ڈاکٹر ناصرہ بصری (جے پور) ۔۔۔ راجستھان یونیورسٹی میں اردو ریفریشر کورس،ڈاکٹر حسن آرا (کوٹہ)۔۔۔ اردو تعلیم اور روزگار،محمد افضل (تمبا ہیڑہ)۔۔۔ ضلع چتوڑگڑھ میں اردو تعلیم و تحقیق،عبدالغفار (ٹونک)۔۔۔ اردو تعلیم سے متعلق محکموں اور اداروں کا رول،شریف احمد (بھرتپور)۔۔۔ ضلع بھرت پور میں اردو تدریس،شاکر علی (اکلیرا جھالاواڑ)۔۔۔ جھالاواڑ میں اردو تعلیم، محمد عادل (اودے پور)۔۔۔ اودے پور میں اردو تعلیم، مختار ٹونکی۔۔۔ اردو تعلیم اور روزگار، ڈاکٹر نادرہ خاتون (کوٹہ)۔۔۔ راجستھان میں خواتین کی اردو تعلیم، ڈاکٹر بدر احمد (ٹونک)۔۔۔ اے.پی.آر.آئی. ٹونک میں اردو تحقیق و تراجم، شمس الضحیٰ خاں حاکم ایوبی (جے پور)۔۔۔ میڈیا، اردو تعلیم اور روزگار۔

وقت کی کمی کے باعث بقیہ حضرات اپنے مقالے نہیں پڑھ سکے۔ سیمینار کے اختتامی اجلاس کی صدارت حکومت راجستھان کے اقلیتی کمیشن کے چیئرمین جناب رگھوبیر سنگھ نے کی۔ ڈاکٹر پروین اختر صاحبہ نے راجستھان میں اردو تعلیم کے فروغ کے لیے طلبہ،شعرا اور ادبا کو وظائف، کتابیں، ریڈنگ روم، اردو کوچنگ سینٹر کھولنے کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر عثمانی نے دو دنوں تک چلنے والے اس سیمینار کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ آخر میں ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے اقلیتی کمیشن کے چیئرمین جناب رگھوبیر سنگھ کو سیمینار کے مقالات اور مباحثوں کی روشنی میں مندرجۂ ذیل تجاویز پیش کیں۔ (1) راجستھان میں اردو درسی کتب کی اشاعت کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کی جائے (2) ٹونک اور اجمیر میں اردو کی ایس.ٹی.سی. پھر سے شروع کی جائے (3) راجستھان اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کی جلد تشکیل کی جائے (4) اردو اکادمی کی جانب سے اردو تعلیم و تدریس پر سیمینار ورک شاپ منعقد کیے جائیں (5) بچوں کے لیے دلچسپ اردو کتب شائع کی جائیں۔

اقلیتی کمیشن کے چیئرمین جناب رگھوبیر سنگھ نے مندرجۂ بالا تجاویز پر اتفاق کرتے ہوئے انھیں پورا کرنے کے لیے پوری کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ عزیز اللہ شیرانی نے تمام شرکا اور معاونین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور سیمینار کے اختتام کا اعلان کیا۔ (ڈاک سے)

''اردو شاعری میں حب الوطنی'' پر دو روزہ سیمینار

● مدھیہ پردیش۔ یو.جی.سی. کے تعاون سے سیفی گولڈن جوبلی قادریہ کالج برہانپور میں 15-14 فروری 2007 کو شعبۂ اردو کی طرف سے دو روزہ سیمینار منعقد کیا گیا۔ جس کا عنوان ''اردو شاعری میں حب الوطنی'' تھا۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت قادریہ ایجوکیشنل سوسائٹی کے سکریٹری ملا شبیر بھائی ظفر نے کی۔ مہمان خصوصی محترمہ فریدہ خان (نائب تحصیل دار برہانپور)، پروفیسر آفاق احمد (بھوپال) اور ڈاکٹر محمد شفیع (برہانپور) تھے۔ شمع روشن ہونے کے بعد تلاوت کلام پاک اور نعت پاک کا نذرانہ ڈاکٹر جمیل راٹھوی نے پیش کیا۔ استقبالیہ خطبہ انچارج پرنسپل بانو نسیم نے دیا، سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر عثمان انصاری نے تمہیدی خطبہ پیش کیا اور خصوصی خطبے کے لیے ڈاکٹر محمد شفیع سے گزارش کی گئی۔ موصوف نے سیمینار کے موضوع کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد پروفیسر آفاق احمد نے سیمینار کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ڈاکٹر عثمان انصاری نے سبھی شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

دوپہر دو بجے دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ مجلس صدارت میں پروفیسر آفاق احمد ڈاکٹر محمد شفیع اور ڈاکٹر عزیز اندوری تھے۔ اس اجلاس میں مندرجۂ ذیل مقالے پیش کیے گئے۔

اسرار احمد (برہانپور)۔۔۔ اقبال کی شاعری میں وطنیت کے عناصر،عشرت ناہید (اندور)۔۔۔ مالوہ کی شاعری میں حب الوطنی کی روایت، عارف انصاری

(برہانپور)۔۔ آزادی کے بعد برہانپور کی شاعری میں حب الوطنی، پروفیسر بلقیس جہاں (بھوپال)۔۔ بیگمات بھوپال اور خواتین کی شاعری میں حب الوطنی، ڈاکٹر ایم.آئی. ساجد (کھامگاؤں)۔۔ جنگ آزادی میں اردو شعرا کا حصہ۔

صدارتی پینل نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مقالوں کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی۔ پرنسپل صاحبہ نے شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر عثمان انصاری نے جلسے کے اختتام کا اعلان کیا۔

15 فروری صبح 10 بجے تیسرا اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس کے صدارتی پینل میں پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر محمد شفیع اور ڈاکٹر ایم.آئی. ساجد شامل تھے۔ اس اجلاس میں مندرجۂ ذیل مقالے پڑھے گئے۔

پروفیسر سجاد حسین جعفری (کھنڈوہ)۔۔ جنگ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ، پروفیسر نازنین منصوری (اندور)۔۔ چکبست کی شاعری میں حب الوطنی کے عناصر، پروفیسر وسیم افتخار (کھرگون)۔۔ کھرگون کی شاعری میں حب الوطنی، ایڈوکیٹ خلیل احمد انصاری (برہانپور)۔۔ اقبال کی شاعری میں حب الوطنی، پروفیسر محمد شکیل شیخ (برہانپور)۔۔ خاندیش کی اردو شاعری میں حب الوطنی، ڈاکٹر سکینہ راج لائٹ والا (بھاؤنگر)۔۔ بوہرہ حضرات کی شاعری میں حب الوطنی، ڈاکٹر سید جمیل الدین جمیل (رانچی)۔۔ اردو کی نعتیہ شاعری میں حب الوطنی، ڈاکٹر صفدر رضا (کھنڈوہ)۔۔ نماز کی اردو شاعری میں حب الوطنی، ڈاکٹر حدیث انصاری (اندور)۔۔ فضا ابن فیضی کی شاعری میں حب الوطنی، ڈاکٹر فہمیدہ منصوری (اندور)۔۔ اردو مثنوی میں حب الوطنی کے عناصر۔

صدارتی پینل نے مقالوں سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

چوتھا اجلاس 2 بجے شروع ہوا۔ صدارتی پینل پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر سید جمیل الدین جمیل اور ڈاکٹر فہمیدہ منصوری پر مشتمل تھا۔ اس اجلاس میں درج ذیل پرچے پڑھے گئے۔

ڈاکٹر عثمان انصاری (برہانپور)۔۔ برج نارائن چکبست کے کلام میں حب الوطنی، ڈاکٹر اقبال شیخ (جل گاؤں)۔۔ اقبال کی شاعری میں وطنیت، ڈاکٹر محمد شفیع (برہانپور)۔۔ اردو ڈراموں میں حب الوطنی، ڈاکٹر عزیز اندوری۔۔ اردو شاعری میں حب الوطنی۔

صدارتی پینل کے اظہار خیال کے بعد پانچواں اجلاس شروع ہوا جو اختتامی تھا۔ اس جلسے کی صدارت قاضی جمیل الدین (ایم.ایل.اے. برہانپور) کر رہے تھے۔ مہمان خصوصی جناب جی.ایس. ڈابر اور جناب ضیا احمد قریشی تھے اور نظامت کے فرائض پروفیسر محمد شفیع نے انجام دیے۔ جلسے کا آغاز نشان یادگار پیش کرنے سے ہوا جو کالج کی پرنسپل پروفیسر بانو نسیم نے مہمانوں کی خدمت میں پیش کیے۔ پروفیسر آفاق احمد نے سیمینار میں پڑھے جانے والے پرچوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اس کامیاب سیمینار میں پڑھے جانے والے پرچوں کا معیار اور سامعین کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر میں بہت خوش ہوں۔ ملا شبیر بھائی ظفر نے اعلان کیا کہ سبھی پرچوں کو اردو کے علاوہ ہندی رسم الخط میں بھی شائع کیا جائے گا۔ (ڈاک سے)

رحمٰن راہی کو گیان پیٹھ ایوارڈ

● نئی دہلی، 9 مارچ۔ کشمیر کے ممتاز شاعر اور ناقد رحمان راہی کو 40واں گیان پیٹھ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ گیان پیٹھ ایوارڈ کی سلیکشن کمیٹی کے کنوینر رویندر کالیہ نے بتایا کہ ڈاکٹر لکشمی سنگھوی کی صدارت میں تشکیل شدہ سلیکشن کمیٹی نے کشمیر کے معروف شاعر اور ناقد جناب رحمان راہی کو ہندوستانی زبان میں اہم کردار ادا کرنے کے لیے سال 2004-05 کا باوقار ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ 6 مئی 1925 کو پیدا ہونے والے جناب راہی، کشمیر کے پہلے قلم کار ہیں جنھیں گیان پیٹھ ایوارڈ دیا جا رہا ہے۔ اس ایوارڈ میں پانچ لاکھ روپئے نقد، ایک توصیفی سند اور ماتا شیروں والی کا علامتی نشان شامل ہے۔ سلیکشن کمیٹی کے دیگر اراکین میں محترمہ مہاشیوتا دیوی، اشوک واجپئی، رماکانت رتھ، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ھیتانشولیش چندر اور سی.ٹی. اندرا شامل ہیں۔ مسٹر رحمان کو 1961 میں ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ مل چکا ہے۔ وہ ساہتیہ اکیڈمی کے فیلو بھی رہیں اور پدم شری ایوارڈ سے بھی انھیں نوازا گیا ہے۔ ان کے پانچ شعری مجموعے اور تنقید پر مبنی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

انتظار حسین اور جاپانی دانشور کو ساہتیہ اکادمی فیلوشپ

● نئی دہلی، 11 مارچ۔ پاکستان کے معروف اردو ادیب انتظار حسین اور جاپانی دانشور مای یا ماٹا کو ساہتیہ اکادمی کی پروقار فیلوشپ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ 84 سالہ انتظار حسین کی پیدائش اتر پردیش کے بلند شہر میں ہوئی۔ وہ

1947 میں پاکستان چلے گئے تھے، آج کل لاہور میں رہتے ہیں۔ انھیں پریم چند فیلوشپ کے لیے منتخب کیا گیا ہے جو سارک ممالک سے وابستہ فن و ادب کے شعبے میں قابل ذکر خدمات پیش کرنے والے شخص کو ہر سال دی جاتی ہے۔ 4 ناولوں اور کہانیوں کے 10 مجموعوں کے خالق انتظار حسین نے اردو اور انگریزی میں ایم.اے. کی ڈگری حاصل کی ہے، وہ کراچی کے اخبار 'ڈیلی ڈان' کے لیے کالم بھی لکھتے ہیں۔ ٹوکیو کے انڈو۔ جاپان آرٹ انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ لسانیات کے ڈائرکٹر مامی یا ماندا کو آنند کمار سوامی فیلوشپ سے نوازا گیا ہے۔ یہ فیلوشپ آرٹ، ثقافت، ادب اور تاریخ کے شعبے میں ریسرچ کو بڑھاوا دینے والے ایشیائی دانشوروں کو دی جاتی ہے۔ 1960 میں پیدا ہونے والے یا ماندا ہندوستانی پُران شاستر کے معروف دانشور ہیں اور اب تک 30 کتابیں لکھ چکے ہیں۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

دہلی اردو اکادمی کے ایوارڈ

● نئی دہلی، 8 مارچ۔ اردو اکادمی دہلی کی ایوارڈ کلچرل سب کمیٹی کی سفارش کو منظوری دیتے ہوئے اکادمی کی ایگزیکٹیو کمیٹی نے اکادمی کے سالانہ ایوارڈز کی توثیق کردی ہے۔ اکادمی کا سب سے بڑا اعزاز 'بہادر شاہ ظفر ایوارڈ' جو کل ہند سطح پر ادب کی مجموعی خدمات کے لیے دیا جاتا ہے معروف ادیب اور دانشور اقبال مجید کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اکادمی نے اس سال سے ایک ایوارڈ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے نام سے دہلی کے ممتاز و معروف قلم کاروں کو دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سال یہ ایوارڈ جس کی رقم مبلغ 51 ہزار روپئے ہے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سابق چیئرمین سینٹر فار انڈین لینگویجز پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کو دیا گیا ہے۔

اردو تحقیق و تنقید کا ایوارڈ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر عظیم الشان صدیقی، تخلیقی نثر کا ایوارڈ، محترمہ ترنم ریاض اور بزرگ افسانہ نگار نند کشور وکرم، شاعری کا ایوارڈ شاہد ماہلی، صحافت کا ایوارڈ نوجوان صحافی معصوم مرادآبادی کو، ترجمے کا ایوارڈ پریم پال اشک کو بہترین استاد کا ایوارڈ گورنمنٹ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول نمبر 2 جامع مسجد کی پرنسپل ڈاکٹر شبانہ نذیر اور گورنمنٹ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول، نورنگر کی محترمہ طلعت فاطمہ کو، الیکٹرانک میڈیا (اردو) کا ایوارڈ اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی میں ایجوکیشن ٹی.وی. کے انچارج سجاد رضوی کو اور بہترین خطاطی کا ایوارڈ معروف و ممتاز خطاط انیس صدیقی کو دیا گیا ہے۔ ایوارڈ برائے فروغ اردو، اردو سافٹ ویئر ان پیج کے پروپرائٹر وی.کے. گپتا کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایوارڈ کلچرل سب کمیٹی کی سفارش پر اکادمی کی ایگزیکٹیو کمیٹی نے سال 2006 کی بہترین کتابوں پر انعامات دینے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ ان انعامات میں 51 سو روپئے فی کس کے 6 انعامات اور مبلغ 35 سو روپئے کے 13 انعامات شامل ہیں۔

—— 51 سو روپئے کے انعامات: رفعت سروش (علم و ادب کے روشن چراغ) وسیم احمد سعید (شانِ اودھ حضرت محل) ویریندر پٹواری (انسان: ڈراموں کا مجموعہ) پروفیسر ابن کنول (تنقید و تحسین) ڈاکٹر خالد اشرف (بیاں اپنا) محمد کاظم (ہندوستانی نکّو ناٹک)۔

35 سو روپئے کے انعامات: پروفیسر ظفر احمد نظامی (صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے.پی.جے. عبدالکلام کی کہانی) ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین (تعارف و تنقید) ڈاکٹر خوشحال زیدی (مبادیات تحقیق) ڈاکٹر عراق رضا زیدی (فارسی میں تاریخ گوئی کی روایت) ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا (یادِ رفتگاں) جناب اظہار عثمانی (سیر کر) ڈاکٹر شفیع ایوب (گرداب۔ ایک مطالعہ) جناب غلام حیدر (آخری چوری) ڈاکٹر جی.آر. کنول (درد آشنا) جناب منیر ہمدم (صدائیں) سہیل انجم (میڈیا: روپ اور بہروپ) ڈاکٹر سمیع الرحمٰن (رپورٹنگ فن اور طریقۂ کار) فیروز ہاشمی (اردو ڈی.ٹی.پی.) سال 2006 کے لیے 51 سو روپئے کا منشی نول کشور ایوارڈ برائے بہترین طباعت ایم.آر. پبلی کیشنز کو دیا گیا ہے۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

ترجمے کے لیے ساہتیہ اکادمی کے انعام

● نئی دہلی، 19 فروری۔ ساہتیہ اکادمی نے 19 ہندوستانی زبانوں کی کتابوں کو ساہتیہ اکادمی ترجمہ انعام کے لیے منتخب کیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں منعقد اکادمی کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا۔ اردو میں ترجمے کے لیے افسانہ نگار ساجد رشید کو چنا گیا۔ جنھوں نے مراٹھی ناول نگار وشواس پاٹل کے ناول 'جھاڑا جھرتی' کا ترجمہ کیا ہے (اردو جیوری میں پروفیسر صادق، حیدر جعفری سید اور پروفیسر سید منظور احمد شامل تھے) بحیثیت افسانہ نگار ساجد رشید سماجی انصاف، احتجاج اور انسانی دردمندی کے لیے مشہور ہیں۔ ان کے افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وشواس پاٹل کا مشہور ناول انھوں نے مراٹھی سے براہ راست ترجمہ

کیا ہے۔ دیگر انعام یافتگان میں ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب 'ابن الوقت' کے انگریزی ترجمے کے لیے ڈاکٹر محمد ذاکر، کشمیری ترجمے کے لیے (مرحوم) نشاط انصاری، پنجابی ترجمے کے لیے کرپال سنگھ کا سیل، کیفی اعظمی کے بنگالی ترجمے کے لیے جیوتی بھوشن چاکی، کالی داس کے میگھ دوت کے نیپالی ترجمے کے لیے اساوری کا کادے، قاضی نذرالاسلام کے تیلگو ترجمے کے لیے پودیار اسوشاہل ہیں۔ ساہتیہ اکادمی ہر سال 24 زبانوں کے مترجمین کو ایوارڈ کے لیے منتخب کرتی ہے۔ یہ ایوارڈ بیس ہزار روپے نقد اور توصیف نامے پر مشتمل ہے۔ تمام انعام اگست 2007 میں ایک تقریب میں دیے جائیں گے۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی)

مختصرات

● علی گڑھ، 17 فروری۔ انڈین اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام علی گڑھ نمائش کے پنڈال ہال میں منعقد ساتویں سالانہ کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی اور آئی۔جی۔ کان پور زون رضوان احمد نے کہا کہ اردو کے بارے میں یہ غلط فہمی ہے کہ وہ مسلمانوں کی زبان ہے، جب کہ سچائی یہ ہے کہ یہ ہندستان کی زبان ہے جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہندستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی۔ اگر اردو کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جس کی وہ حقدار تھی تو اس کے لیے کسی حد تک اردو والے بھی ذمے دار ہیں۔ دلی حج کمیٹی کے چیئرمین اور سماجی رضاکار جناب سلامت اللہ نے کہا کہ ملک میں اردو کی توسیع و ترقی کے لیے ریاستی سطحوں پر کوشش ہونی چاہیے اور ریاستی سرکاروں کو اس سلسلے میں پہل کرنی چاہیے۔ شہر ممبر اسمبلی وویک بنسل نے کہا کہ اردو جو لوگوں کو ایک لڑی میں پروتی ہے، اس کی بقا اور ترقی کے لیے ہم سبھی کو مل جل کر کام کرنا چاہیے۔ سماج وادی پارٹی ضلع صدر ڈاکٹر رچھپال سنگھ نے کہا کہ آزادی سے قبل اردو ہر شہری کی زبان تھی مگر افسوس کہ آج یہ سمٹ کر رہ گئی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے رابطہ عامہ افسر ڈاکٹر راحت ابرار نے اردو صحافت کی تاریخ پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے اسے مرتب کرنے پر زور دیا۔ کلیدی خطبے میں دوردرشن کے ڈائرکٹر قربان علی نے کہا کہ اردو ہماری مشترکہ تہذیب کی علمبردار ہے۔ یہ الزام غلط ہے کہ مسلم حکمرانوں نے عوام پر زبردستی اس زبان کو تھوپا۔ کو مفتی زاہد علی، ڈاکٹر شافع قدوائی اور طارق حسن نے بھی کانفرنس سے خطاب کیا۔ اس سے قبل ایسوسی ایشن سکریٹری محمد احمد شیون نے سالانہ رپورٹ پڑھی اور صدر و کنوینر مبین خاں نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 21 فروری۔ موجودہ عہد سائنس، ٹکنالوجی اور اطلاعات کا عہد ہے جس میں نئی نسل کو اپنے لیے مقام حاصل کرنا ہے اور عہد جدید کی نمائندگی بھی کرنی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ذاکر حسین کالج کی سالانہ تقریب میں بطور مہمان خصوصی شرکت کرتے ہوئے نامور شاعر اور فلم ساز پدم شری گلزار نے کیا۔ انھوں نے طلبہ کی زود فہمی، شفافیت اور ایمان داری کی تعریف کی اور کالج کی سائنسی اور ثقافتی روایات کو آگے بڑھانے پر زور دیا۔ انھوں نے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی درخواست پر اپنی ایک نظم ''فرار کی آرزو'' بھی سنائی۔

پرنسپل ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے گلزار کا استقبال کرتے ہوئے ان کا تعارف پیش کیا اور کالج کی علمی، ادبی، تاریخی اور سیاسی خدمات کو نمایاں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کالج کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ محمد حسین آزاد، پیارے لال آشوب، پنڈت موتی لال بسمل، منشی شیو نارائن آرام، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری، اختر الایمان، جمیل الدین عالی، جاوید وششٹ، راج نرائن راز، پریم پال اشک اور جمیلہ بانو جیسی شخصیات اس کالج کی پروردہ رہی ہیں۔ اس موقع پر گلزار کے ہاتھوں ان طلبہ کو انعامات سے نوازا گیا جنھوں نے اس سال مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ڈاکٹر سوکرتی نے تمام مہمانان اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی)

● حیدرآباد، 13 فروری۔ اردو ذریعۂ تعلیم کے طلبہ میں سماجی و معاشی حالات کے باعث سکنڈری ایجوکیشن کی سطح سے ترک تعلیم کا رجحان اقلیتوں کی ناخواندگی کا سب سے بڑا اور اہم سبب ہے۔ ان خیالات کا اظہار جناب ایس بالا سبرامنیم، آئی۔اے۔ایس۔، ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مرکز برائے پیشہ ورانہ فروغ کی جانب سے دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے منعقد کیے جا رہے چار روزہ اورینٹیشن پروگرام میں بحیثیت مہمان خصوصی اپنی افتتاحی تقریر کے دوران کیا۔ وائس چانسلر پروفیسر اے۔ ایم۔

پٹھان نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ جناب ایس بالا ابراہیم نے کہا کہ اردو اساتذہ وسائل اور روزگار کے خاطر خواہ مواقع کی کمی کے باعث بھی اردو میڈیم مدارس کے طلبہ کی تعداد میں کمی آرہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسکول ایجوکیشن کی جانب سے مدرسہ ایجوکیشن کے لیے ایک خصوصی اسکیم کے تحت اساتذہ کی تنخواہوں کے علاوہ دیگر سہولتوں کی فراہمی کے لیے بھی اقدامات کیے جارہے ہیں۔ انھوں نے تعلیمی شعور کی بیداری کے لیے ایک مبسوط حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، معتمد عمومی، دینی مدارس بورڈ نے بحیثیت مہمان اعزازی اپنے خطاب میں کہا کہ سائنس و ٹکنالوجی کی زبان نہ ہونے کے باوجود دینی مدارس کے باعث ملک کے گوشے گوشے میں اردو ایک زندہ زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا سیف اللہ رحمانی نے اردو یونیورسٹی کی جانب سے چلائے جانے والے ایم.بی.اے.، جرنلزم، بی.ایڈ. ڈی.ایڈ. جیسے کورسز کو اردو میں جدید علوم کے فروغ کا آغاز قرار دیا۔ جناب رحیم الدین انصاری، صدر آندھرا پردیش اردو اکادمی نے اپنے مختصر خطاب میں دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے اردو یونیورسٹی کی جانب سے منعقد کیے جانے والے اورینٹیشن پروگرام کو وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس یقین کا اظہار کیا کہ اس طرح کے پروگرام دینی مدارس کی کارکردگی سے واقف ہونے کی خواہش رکھنے والوں کے لیے معاون ثابت ہوں گے۔
مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقل، بانی جامعہ دارالعلوم حیدرآباد وصدر دینی مدارس بورڈ نے بحیثیت مہمان اعزازی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے حیدرآباد میں قیام کو اردو کی نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا۔ وائس چانسلر پروفیسر اے.ایم. پٹھان نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اس طرح کے اورینٹیشن پروگرام درحقیقت دینی مدارس کے اساتذہ کو پیشہ ورانہ طور پر خود مکتفی بنانے نیز انھیں عصری و جدید ٹکنالوجی کے استعمال سے واقف کروانے میں کلیدی رول ادا کر سکتے ہیں۔ پروفیسر پٹھان نے کہا کہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں اردو یونیورسٹی ملک کی وہ واحد جامعہ ہے جہاں اردو میں روایتی اور فاصلاتی طرز تعلیم کے تحت اعلیٰ تعلیم کا نظم ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی بہت جلد ایک یونانی میڈیکل کالج کے قیام کے علاوہ ملک کی ہر ریاست میں کم از کم دو اردو ماڈل اسکول قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی آٹھ یا دس ریاستوں میں انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اور ٹیچرس ٹریننگ کالج کا قیام بھی یونیورسٹی کی اولین ترجیحات میں شامل ہے۔ پروفیسر پٹھان نے کہا کہ سچر کمیٹی نے بھی پرائمری سطح سے اردو ذریعۂ تعلیم کو ترقی دینے کی سفارش کی ہے۔ ڈاکٹر کے.آر. اقبال احمد، پرو وائس چانسلر و رجسٹرار انچارج نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی تعلیمی و تعمیری سرگرمیوں کی تفصیلی رپورٹ پیش کرتے ہوئے دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے منعقد کیے جانے والے اس اورینٹیشن پروگرام کو ایک اہم اقدام قرار دیا۔ ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، انچارج شعبۂ تعلقات عامہ نے ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن جناب ایس بالا ابراہیم کا تعارف پیش کیا اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔

(ڈاک سے)

● پٹنہ، 12 مارچ۔ ''اردو ادب کے سنجیدہ طالب علموں کے لیے معاصر اردو ادب سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ معاصر شعر و ادب اور نظریات پر طالب علم کو ادب کی پرکھ میں تعاون پہنچاتی ہے۔'' ان خیالات کا اظہار پروفیسر فاروق احمد صدیقی، صدر شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی نے شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں طلبہ کی جانب سے ''معاصر اردو ادب، صورت حال'' پر منعقدہ ایک سیمینار میں کیا۔ انھوں نے طلبہ کو معاصر اردو ادب کے مطالعے کے ساتھ اپنی تحریروں سے موجودہ ادبی منظر نامے پر اپنی موجودگی ثبت کرنے کی تلقین بھی کی۔ انھوں نے کہا کہ آپ داد و تحسین یا تنقیص کی پروا کیے بغیر لکھیں۔ زمانہ سب سے بڑا نقاد ہے اور وہی فیصلہ کرے گا کہ کس کی تحریروں میں کتنی قوت ہے۔ اپنے اساتذہ کو رہنما بنائیے اور خوب پڑھیے لکھیے۔'' سیمینار میں طلبہ نے معاصر ادب کے مختلف گوشوں پر مقالات پیش کیے۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، پروفیسر انیس فاطمہ، پروفیسر سعیدہ وارثی، ڈاکٹر شائستہ انجم نوری، ڈاکٹر سرور عالم ندوی (پٹنہ) ڈاکٹر ناظمہ جبیں (احمد آباد) اور ڈاکٹر مسیح الدین (احمد آباد) نے شرکت کی۔

سیمینار کے آغاز میں ناظم جلسہ شہاب ظفر اعظمی نے معاصر اردو شعر و ادب پر مختصر روشنی ڈالی اور آزادی کے بعد سے اب تک ہوئے تجربات و رجحانات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے 1980 کے بعد لکھے گئے ناولوں، افسانوں، تنقید اور شاعری کو توانا، مثبت، اور اہم قرار دیا جن میں موضوع، فکر اور اسلوب کی تبدیلیوں کو واضح انداز میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسرائیل رضا نے کہا کہ کلاسیکی متن اور نصابی کتابوں کے بجائے معاصر اردو کا موضوع اس لیے رکھا گیا تا کہ طلبہ زبان و ادب کے ارتقا کو بخوبی محسوس

کرسکیں۔ سیمینار میں طلبہ وطالبات کی جانب سے کل پندرہ مقالے پڑھے گئے جن میں ملکہ تسنیم، نشاط خان، فائزہ احمد، اکمل حسین، عنبریں ارم، فوزیہ تبسم، زرنگار یاسمین، شفیعہ جمیل، فوزیہ ترنم، مختار عالم، طلعت پروین، مستفیض احمد، ہاجرہ پروین، افشاں بانو اور فرزانہ خاتون کے مقالے خاص طور پر پسند کیے گئے۔

خصوصی مدعوئین نے ترقی پسندی سے جدیدیت اور پھر مابعد جدیدیت تک کے سفر کو اردو ادب کے ارتقا سے تعبیر کیا اور کہا کہ ایسی ہی تبدیلیوں سے ادب زندہ رہتا ہے اور ادب میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔

(ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی، 6 فروری۔ بزم جامعہ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سیمینار ہال میں مشہور شاعر اظہر عنایتی کے اعزاز میں استقبالیہ نشست کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے کی۔ ڈاکٹر شہزاد انجم نے حاضرین کا استقبال کیا اور اظہر عنایتی کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر خالد محمود نے کہا کہ اظہر عنایتی کی شاعری فکر وفن کا دلآویز نمونہ کہی جا سکتی ہے۔ پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے کہا کہ اظہر عنایتی دراصل ہمارے تہذیبی رویوں کے شاعر ہیں۔ اظہر عنایتی کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے تہذیبی ورثے اور قدروں کا ماتم نہیں کرتے بلکہ ان مثبت اقدار کے لیے یک گونہ جستجو ہے۔ اس موقع پر اظہر عنایتی نے اپنا کلام بھی پیش کیا جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

● نئی دہلی، 22 فروری۔ مرزا غالب کے 138ویں یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے 38ویں یوم تاسیس کے موقع پر غالب اکیڈمی میں غالب کی زمین میں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت رفعت سروش اور نظامت شکیل حسن شمسی نے کی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے۔ مندرجۂ ذیل شعرا نے شرکت کی: رفعت سروش، گلزار دہلوی، وقار مانوی، مخمور سعیدی، نصرت گوالیاری، متین امروہوی، ابرار کرتپوری، نرمل سنگھ نرمل، اسد رضا، تابش مہدی، ڈاکٹر ظفر مرادآبادی، نور جہاں ثروت، شہپر رسول، فرحت احساس، شکیل حسن شمسی، سلیم صدیقی، اقبال فردوسی اور شعیب مرزا۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

● نئی دہلی، 9 مارچ۔ طاہر اپارٹمنٹ، نیر منزل، جامعہ نگر میں کوثر صدیقی، سیفی سرونجی، جاوید یزدانی اور انل اگروال کی دہلی آمد پر اعزازی نشست کا انعقاد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی اور پروفیسر اختر الواسع بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ نظامت ڈاکٹر احمد محفوظ نے کی۔ اس موقع پر کاروان ادب بھوپال کے مدیر کوثر صدیقی کے مجموعۂ نظم ''ڈھائی آکھر'' اور انتساب کے ایڈیٹر ڈاکٹر سیفی سرونجی کی کتاب ''نئی غزل نئے امکانات'' اور کاروان ادب کے خصوصی شمارے ''گوشۂ شفیقہ فرحت'' کا اجرا عمل میں آیا۔ ''ڈھائی آکھر کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ کوثر صدیقی بیک وقت کئی صنفوں کو برتنے پر قادر ہیں۔ دوہا چھند پر مشتمل ''ڈھائی آکھر'' کا عنوان دراصل ہمارے تہذیبی حافظے کو بیدار کرنے والا عنوان ہے۔ ''نئی غزل نئے امکانات'' کی رونمائی کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے سیفی سرونجی کی کتاب کو نئی غزل کی تنقید میں ایک اہم پیش رفت قرار دیا۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ڈاکٹر نگار عظیم، انور نزہت اور ذکیہ ظفر نے ''کاروان ادب'' کا اجرا کیا۔ ڈاکٹر خالد محمود نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں درج شعرا نے اپنا کلام سنایا:

پروفیسر عتیق اللہ، اظہر ندوی، سیفی سرونجی، کوثر صدیقی، سہیل احمد فاروقی، خالد محمود، احمد محفوظ، کوثر مظہری، مولا بخش اسیر، عبید الرحمن اور نگار عظیم۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

● نئی دہلی، 26 فروری۔ اے.ئی.ایس. گروپ اور اردو اکادمی دہلی کے اشتراک سے غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین میں ''ایک شام محبت کے نام'' عنوان سے مشاعرہ اور پانچویں قومی یکجہتی محبت ایوارڈ تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت انیس احمد خاں انیس اور نظامت معین شاداب نے کی۔ مشاعرہ میں دہلی اور بیرون دہلی کے جن شعرا نے شرکت کی۔ ان کے اسمائے گرامی ہیں:

گلزار دہلوی، وقار مانوی، انیس احمد خاں انیس، طالب رامپوری، نعیم نجمی، فصیح اکمل، سریندر شجر، س.ش. عالم، پی. پی. سریواستو رند، اسد رضا، شکیل شمسی، شہباز ندیم ضیائی، اشوک ساہنی، کمال جعفری، معین شاداب، سلیم صدیقی، مہیش منظر، انور باری، صالحین نہی، رؤف رامش اور ناشاد مرادآبادی۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

● نئی دہلی، 18 مارچ۔ آئیڈیا کمیونکیشن نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انڈیا۔عرب کلچر سینٹر کے اشتراک سے ایک شعری نشست کا اہتمام کیا۔ یہ نشست انجمن محبان اردو ہند قطر کی جانب سے امسال منعقد ہونے والے عالمی مشاعرے میں شرکت کے لیے جانے والے شعرائے کرام پروفیسر مظفر حنفی، منور رانا، عادل لکھنوی، نعیم اختر خادمی، ریحانہ شاہین، نوشاد مومن اور ماجد دیوبندی کے اعزاز میں منعقد کی گئی۔ نشست کی صدارت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اقلیتی شعبے کے سکریٹری انیس درّانی نے کی، جب کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رجسٹرار ایس۔ایم۔افضل نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ نشست میں انجم عثانی نے انجمن محبان اردو ہند قطر اور آئیڈیا کمیونکیشن کا تعارف کرایا، جب کہ ڈاکٹر شاہد پرویز نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ نظامت آصف اعظمی نے کی۔ درج ذیل شعرا نے کلام سنایا:

الطاف اعظمی، شیث اسماعیل اعظمی، منور رانا، خالد محمود، شہپر رسول، نعیم اختر خادمی، تابش مہدی، ماجد دیوبندی، سکندر عاقل۔ ریحانہ شاہین نے اپنے ترنم اور عادل لکھنوی نے اپنی مزاحیہ شاعری سے سامعین کو محظوظ کیا۔ نشست میں ڈاکٹر شکیل تمنا، مشرف حسین صدیقی، ذکیہ ظفر اور فیصل امین الاسلام نے خصوصی طور پر شرکت کی۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

● نئی دہلی، 27 فروری۔ اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام جعفر آباد کے زینت محل اسکول میں ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا، جس میں تقریباً 40 شعرا و شاعرات نے شرکت کی۔ اس موقع پر بحیثیت مہمان خصوصی مشرقی دہلی کے ممبر پارلیمنٹ سندیپ دیکشت نے اردو زبان و ادب سے نہایت متاثر ہونے کا اعتراف کیا اور کہا کہ شعرا سماج کا آئینہ ہوتے ہیں اور سماج کی سوچ بدلنے کے لیے چوبیسوں گھنٹے ان کا دماغی کمپیوٹر کام کرتا رہتا ہے۔ اسکول کے پرنسپل انل کمار دشست نے کہا کہ وہ محبان اردو کے درمیان میں رہ کر اردو زبان سے اتنی محبت کرنے لگے ہیں کہ اسکول میں بھی اردو پڑھنے اور پڑھانے پر مجبور ہوگئے۔ چودھری متین احمد نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ جتنا اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے اور فروغ کے لیے کام ہوگا ملک میں اتنی ہی قومی یکجہتی، آپسی بھائی چارہ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم ہوگی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کو اس کا آئینی حق ضرور ملے گا۔ اس کل ہند قومی مشاعرے میں رئیس احمد بسمل، مقصود جمال، اسرار قریشی، چمن علی ہاشمی، طاہر عرشی، محمد ایوب انصاری، شاہد چنگیزی، قمر الحسن کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

● گنگوہ، 8 مارچ۔ رشید مسعود فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام گنگوہ کے سابق چیئرمین مرحوم قاضی راشد مسعود کی یاد میں ایک آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام گوئل رائس مل کے وسیع و عریض میدان میں کیا گیا۔ مشاعرے کی شمع رشید مسعود اور سماجوادی پارٹی سہارنپور زون کے ذمہ دار راجکمار یادو نے مشترکہ طور پر روشن کی۔ صدارت سماجوادی ممبر پارلیمنٹ امیر عالم خاں نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض ماجد دیوبندی نے انجام دیے۔ مشاعرے میں درج ذیل شعرا نے شرکت کی:

الطاف ضیاء، سریندر شجر، ملک زادہ جاوید، ضیا ٹونکی، اختر گوالیاری، نزہت انجم، جمیل خیرآبادی، شائستہ ثنا، انجم بارہ بنکوی، جوہر کانپوری، مظفر رزمی، راحت اندوری، ماجد دیوبندی، وسیم بریلوی کے علاوہ سکندر حیات گڑبڑ اور ساغر خیامی نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

رسمِ اجرا

کالم برداشتہ

● حیدرآباد۔ ممتاز ماہر معاشیات پدم بھوشن پروفیسر سی۔ایچ۔ ہنمنت راؤ نے آج شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے زیر اہتمام ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین کو پدم شری کا اعزاز ملنے کے سلسلے میں منعقدہ تہنیتی تقریب میں کہا کہ جب تک مجتبیٰ حسین جیسے اہل قلم موجود ہیں تب تک اردو ختم نہیں ہوسکتی۔ مجتبیٰ حسین سے اپنی پچاس سالہ دوستی کا حوالہ دیا اور کہا کہ انھیں کم وبیش پچاس سال کے بعد اردو میں تقریر کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس تقریب میں وائس چانسلر سنٹرل یونیورسٹی جناب سید احتشام حسنین، جناب نریندر لوتھر، محترمہ لکشمی دیوی راج، عبداللہ خاں عابد، یونیورسٹی کے اساتذہ اور کئی معزز شخصیات نے شرکت کی۔ ابتدا میں طالبات نے اقبال کا ترانۂ ہندی پیش کیا۔ پروفیسر بیگ احساس

نے مجتبیٰ حسین کا تعارفی خاکہ پیش کیا۔ پروفیسر سید احتشام حسنین شیخ الجامعہ نے مجتبیٰ حسین سے اپنے قدیم خاندانی مراسم کا ذکر کیا اور مجتبیٰ حسین کی تازہ تصنیف ''کالم برداشتہ'' کی رسم اجرا انجام دی۔ کتاب کے مرتب سید امتیاز الدین نے دلچسپ انداز میں کتاب کا تعارف پیش کیا۔ جناب نسیم الدین فریس، ڈاکٹر علی ظہیر اور محترمہ لکشمی دیوی راج نے بھی اظہار خیال کیا۔ جناب نریندر لوتھر نے مجتبیٰ حسین کو دلی مبارکباد پیش کی۔ جناب مظفر شہ میری نے نظامت کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیے۔

زہرباد

''ادارہ سائبان ادب کے زیر اہتمام 3 فروری کی شام مستی پور کی معروف درسگاہ ملت اکیڈمی میں جناب انور شمیم کے پہلے شعری مجموعے ''زہرباد'' کی رسم اجرا بہار قانون ساز کونسل کے ڈپٹی لیڈر پروفیسر اسلم آزاد کے ہاتھوں ہوئی۔ پروفیسر آزاد نے کہا کہ انور شمیم دور حاضر سے مطمئن نہیں ہیں۔ آج کے انسان کی متضاد ذہنی کیفیات اور مسلمہ انسانی اقدار کی بے حرمتی، مادہ پرستی سے پیدا ہونے والی برائیاں اور کسی مربوط و منظم فلسفۂ حیات کی غیر موجودگی جھنجھلاہٹ تو پیدا کرتی ہے لیکن اس کیفیت پر ان کا بھرپور اعتقاد اور روشن مستقبل پر اعتماد جلد قابو پالیتا ہے اور ان کی شاعری ایک روشن مستقبل کی بشارت دیتی ہے۔ ڈاکٹر انیس صدری نے انور شمیم کی شاعری میں بیان کی سادگی اور الفاظ کے تخلیقانہ استعمال کی داد دیتے ہوئے ان کے اشعار کوٹ کیے۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی نے منظوم خراج تحسین پیش کیا۔

(ڈاک سے)

وحشت شناسی

● کولکاتا، 27 فروری۔ خضرپور کالج کے شعبۂ اردو کی جانب سے پروفیسر سید علی عرفان نقوی کی کتاب 'وحشت شناسی' کا اجرا قیصر شمیم کے ہاتھوں ہوا۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر ابوبکر جیلانی نے کی۔ پروفیسر اسد الزماں اسد نے پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کالج میں شعبۂ اردو کی ابتدا میں میں تنہا تھا اور پانچ طلبہ تھے۔ آج 150 طلبہ و طالبات کو دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ وحشت کے سلسلے میں جو کتاب ترتیب دی گئی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ پروفیسر شمیم انور نے کتاب کے کئی گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالی۔

اس تقریب میں پروفیسر ابوبکر جیلانی، پروفیسر عرفان نقوی اور پروفیسر شمشیر عالم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اشرف احمد جعفری نے ایک مضمون ''خضرپور کالج کا ایک کارنامہ وحشت شناسی'' کے عنوان سے پڑھا۔ انھوں نے کتاب میں شامل 14 مضامین کا اجمالی جائزہ پیش کیا۔

اس تقریب کی نظامت پروفیسر دیبا ہاشمی نے کی جب کہ اظہار تشکر ڈاکٹر درخشاں زریں نے کیا۔ طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد کے ساتھ پروفیسر محمود ریاض اور شکیل احمد بھی موجود تھے۔ کالج کے دیگر شعبوں کے اساتذہ نے بھی محفل میں حصہ لیا۔ (ڈاک سے)

موروآمی

● نئی دہلی، 8 فروری۔ بزم جامعہ شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام پروفیسر ادریس صدیقی کے افسانوی مجموعے 'موروآمی' کا اجرا پروفیسر تقی حسین جعفری اور پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی نے کیا۔ تقریب کی صدارت قاضی عبیدالرحمن ہاشمی نے اور نظامت ڈاکٹر شہپر رسول نے کی۔ ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے ادریس صدیقی کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی نے کہا کہ ان کہانیوں کو پڑھ کر حیرت انگیز مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ اس سے قبل ادریس صدیقی کی بہت سی کہانیاں ماحولیات کے تناظر میں سامنے آئی تھیں۔ پروفیسر تقی حسین جعفری نے کہا کہ صنعتی انقلاب نے دنیا کی جو کایا پلٹ کی ہے اس کا سب سے زیادہ نقصان بچوں کو اٹھانا پڑا ہے۔

(روزنامہ'' راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

اچھوت خون

● پٹنہ، 8 فروری۔ گذشتہ 3 فروری کو اعجازی ہاؤس مظفرپور میں منعقد ایک تقریب میں ڈاکٹر منصور احمد اعجاز کے افسانوں کے مجموعے ''اچھوت خون'' کا اجرا کیا گیا۔ جلسے کی صدارت مسٹر کیلاش پرساد سنہا ایڈوکیٹ صدر ضلع بار ایسوسی ایشن نے کی۔ ''اچھوت خون'' میں 24 کہانیاں شامل ہیں۔ اس سے قبل ڈاکٹر اعجازی کی کہانیوں کا مجموعہ ''وسیلہ'' منظر عام پر آچکا ہے۔ ڈاکٹر اعجازی فی الحال محکمۂ شہری ترقیات میں انڈر سکریٹری کے عہدے پر فائز ہیں۔

(روزنامہ'' راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی)

□□□

تبصرہ وتعارف

اردو زبان کی تدریس

مصنف: معین الدین

صفحات: 147، قیمت: -/43روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

مبصر: رئیس احمد، 1007/1 آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110022

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1983 میں شائع ہوا تھا یہ نظر ثانی شدہ چھٹا ایڈیشن ہے جو 2004 میں زیور اشاعت سے آراستہ ہوا۔ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ جملہ اساتذہ مع زیر تربیت اساتذہ کے لیے یہ کتاب ایک رہنما کا درجہ رکھتی ہے۔ مصنف نے مطالعے کی آسانی کے لیے اسے پندرہ ابواب میں تقسیم کیا ہے جو اس طرح ہیں۔

1. زبان
2. تدریس اردو کے مقاصد
3. تدریس نثر
4. تدریس نظم
5. تدریس غزل
6. تدریس انشا
7. گرامر کی تدریس
8. مطالعہ
9. نصاب
10. درسی کتب
11. بچوں کا ادب
12. تدریس اردو (غیر اردو داں کے لیے)
13. اندازۂ قدر
14. امدادی سامان اور دیگر وسائل
15. اشارات اسباق

پہلے باب میں زبان اور اس کی مختلف قسموں مثلاً اشاروں کی زبان، آوازوں کی زبان اور علامتوں کی زبان سے مختصراً متعارف کرانے کے علاوہ بولی اور زبان کا فرق واضح کیا گیا ہے نیز مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت و افادیت پر بھی زور دیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں — ''زبان آوازوں کا ایک نظام ہے جو بچے کے دماغ کو متحرک کرتا ہے۔ اس کے وسیلے سے وہ خود بخود اظہار و تفہیم کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ یہ منصب مادری زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں ادا کرسکتی۔ مادری زبان کے ذریعے ہی بچہ اپنی تہذیب و معاشرت سے مطابقت اور رابطہ پیدا کرتا ہے۔ مادری زبان سے آموزش میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔ مادری زبان دیگر مضامین کی تعلیم کا بھی ایک موثر ذریعہ ہے''۔ دوسرے باب — ''تدریس اردو کے مقاصد'' میں مصنف نے مقاصد کا تعین، تعلیمی مقاصد، عام مقاصد اور پرائمری منزل تا ثانوی منزل جیسے موضوعات کو شامل کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ — ان مقاصد کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب اساتذہ اردو زبان و ادب کا شعور اور تغیر پذیر زندگی کی گہری بصیرت رکھتے ہوں۔ ''تدریس نثر'' تیسرا باب ہے جس میں نصاب، معیار کی پستی، مقاصد، تمہید، اعلان سبق، نمونے کی بلند خوانی، تلفظ کی مشق، اخذ معنی، خاموش مطالعہ، تفہیم عبارت، اسلوب بیان، زبان کا کام اور انفرادی بلند خوانی جیسے موضوعات پر وضاحت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے اور تدریس نثر میں ان مراحل کی اہمیت و افادیت کو واضح کیا ہے۔ تدریس کے دوران اساتذہ کی رہبری اور رہنمائی کے تعلق سے یہ باب رہنما اصول فراہم کراتا ہے۔

چوتھا باب — ''تدریس نظم'' ہے جس میں نثر و نظم کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے معیار کی پستی، نصاب، انتخاب، مقاصد، تمہید، اعلان سبق، نمونے کی بلند خوانی، اجمالی اور تفصیلی جائزہ، استحسان نظم، اسلوب بیان اور انقلابی بلند خوانی جیسے تدریسی مراحل پر گفتگو کرتے ہوئے دوران تدریس ان کی افادیت کو واضح کیا ہے۔ ''تدریس غزل''، پانچواں باب ہے، جس میں اردو شاعری کی آبرو صنف غزل کے موضوعات و محاسن پر جامعیت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے اور جماعت رکلاس میں تدریس کے دوران پیش آنے والے مراحل و مقاصد، تمہید، اعلان سبق، نمونے کی بلند خوانی، جائزہ، استحسان غزل، اسلوب بیان اور انفرادی بلند خوانی سے اجمالاً متعارف کرایا ہے۔ ان رہنما اصول و نظریات کا مطالعہ اساتذہ کے لیے بطور خاص مدد و معاون ہوگا۔ چھٹے باب کو — ''تدریس انشا'' کے لیے مختص کیا ہے۔ ثانوی سطح پر نثر و نظم کی تدریس کے بعد تدریس انشا کی اہمیت مسلم ہے۔ صاحب کتاب نے تدریس انشا کے ذیل میں مفصل و مدلل گفتگو کی ہے جس میں عام ملحوظات کے علاوہ خصوصی مسائل، مقاصد، تقریری اور تحریری انشا، موضوع کا انتخاب، زبانی اظہار خیال، مضمون کا خاکہ، مضمون کے اجزا اور غلطیوں کی اصلاح و مشق جیسے ذیلی عنوانات کی روشنی میں اپنی بات کو پختگی اور استحکام بخشا ہے۔

ساتواں باب — گرامر کی تدریس کے لیے مخصوص ہے۔ مصنف نے اس باب میں اردو گرامر کی اہمیت اور طریقۂ تدریس پر روشنی ڈالی ہے جس میں علم ہجا، علم صرف اور علم نحو کے علاوہ استخراجی اور استقرائی طریقے کی وضاحت

کی ہے۔ آٹھویں باب میں بطور خاص— ''مطالعہ'' کو موضوع بنایا ہے۔ جس میں خاموش مطالعہ، بہ آواز بلند مطالعہ (ادائیگی، آواز کا زیر و بم اور اظہار) مطالعہ اور تفہیم مطالعے کی نفسیات کی صراحت کی گئی ہے جو تدریسی عمل کے لیے مفید مطلب اور کارآمد ہے۔

نویں باب— کا موضوع ''نصاب'' ہے جس میں عام ملحوظات کے ساتھ ساتھ تعین نصاب، ابتدائی تا ثانوی منزل اور حصول مقاصد پر اظہار خیال کیا ہے۔ دسواں باب— ''درسی کتاب'' کے لیے مختص ہے جس میں مواد مطالعہ، انتخاب مواد، مشقی سوالات، ظاہری پہلو اور درسی کتب کا اندازۂ قدر (انتخاب، اصلاح اور مطالعہ و تحقیق) پر تفصیلی گفتگو کی ہے، گیارھویں باب میں بچوں کے ادب پر بات کی گئی ہے جس میں بچوں کی کتابیں اور بچوں کی نشو و نما کی منزلیں (اول تا سوم) زیر بحث ہیں۔

بارھواں باب— ''تدریس اردو— غیر اردو داں طلبہ کے لیے'' ہے۔ اس باب میں ہندی داں کو اردو پڑھانا۔ غیر ہندی داں کو اردو پڑھانا اور بیرونی زبان کی حیثیت سے اردو پڑھانا کے علاوہ تدریس زبان میں لسانیات کی اہمیت، طریقۂ تدریس، گفتگو کا طریقہ، طریقۂ راست اور ترجے کا طریقہ جیسے مختلف ذیلی عنوانات کے تحت مصنف نے اپنی تجاویز اور خیالات کا اظہار کیا ہے جو اساتذہ کے لیے غیر اردو داں طلبہ کو اردو زبان کی تدریس کے ذیل میں معاون ہوگا۔ ''اندازۂ قدر'' تیرھواں باب ہے جو مواد مضمون کا انتخاب، تدریسی مقاصد، آموزشی تجربات، آزمائش، معروضی آزمائش اور مدّات کی قسمیں جیسے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔

طریقۂ تدریس میں امدادی تعلیمی سامان اور دیگر وسائل کی بڑی اہمیت ہے اور چودھواں باب اسی ضرورت و اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ امدادی سامان تعلیم میں— تختۂ سیاہ، چارٹ اور تصاویر، ماڈل، فلم پروجیکٹر، اپی ڈیا سکوپ، گراموفون و لنگوافون، ٹیپ ریکارڈ، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کے علاوہ دیگر وسائل میں انجمن مباحثہ، دیواری رسالہ، بزم ادب، مشاعرہ، بیت بازی اور ڈرامے وغیرہ کی رہمت اجاگر کی گئی ہے۔

آخری باب— ''اشارات سبق'' میں سات اسباق کے مثالی نمونے پیش کیے ہیں جن کے مطالعے سے اساتذہ نیز زیر تربیت اساتذہ روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ بہ اعتبار مجموعی ''اردو زبان کی تدریس'' اپنے موضوع پر ایک جامع کتاب ہے جس کا مطالعہ ہر سطح کے اساتذہ اور زیر تربیت اساتذہ کے لیے ناگزیر ہے۔ اس معیاری اور خوبصورت اشاعت کے لیے ناشر و مصنف ہر دو مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی

مصنف: ہارون ایوب

صفحات: 144، قیمت۔12 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

مبصر: ارشاد عالم، 29 اولڈ برہم پتر ہاسٹل، جے۔این۔یو، نئی دہلی۔ 110067

مرزا عظیم بیگ چغتائی مقبول عام ادب لکھتے تھے۔ مقبول عام ادب کا معیار ہر نسل میں بدلتا ہے۔ ایک نسل کسی ادیب کو سینے سے لگا کر رکھتی ہے تو دوسری نسل کبھی کبھی اس ادیب کے نام تک سے واقف نہیں ہوتی۔ بقول علامہ شبلی نعمانی 'ادیب کی طرح ادب پاروں کی بھی عمر ہوتی ہے' کوئی ادب پارہ اپنے خالق کے ساتھ جیتا ہے اور اسی کے ساتھ مر جاتا ہے۔ کچھ ایک دو نسل تک زندہ رہتا ہے اور کچھ سو دو سو سال۔ کچھ ہی فن پارے ایسے ہوتے ہیں جن کو بقائے دوام حاصل ہو پاتا ہے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی بھی ایک ایسے ہی ادیب ہیں جو اب تک اردو کی ادبی روایت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ہارون ایوب نے زیر تبصرہ کتاب میں نہایت ہی سادہ اور سلیس زبان میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کے احوال و کوائف، اسلوب بیان اور اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ان کے مقام پر مختصر مگر جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کے خانگی احوال و کوائف، عادات و اطوار، ادبی زندگی، اہم تصانیف کا تعارف، تنقیدی آرا کے علاوہ آخر میں ان کا ایک شاہ کار افسانہ بھی شامل کتاب ہے۔ اولین تین ابواب میں حالات زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ضمنی طور پر اس میں ادبی کاوشوں کا بھی ذکر در آیا ہے۔ اگلے چار ابواب میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کی تصانیف کے جائزے کے علاوہ اسلوب نگارش، موضوعات اور افسانہ نویسی کے بارے میں خود مرزا عظیم بیگ چغتائی کے خیالات پر روشنی ڈالی ہے۔

آٹھویں باب میں مرزا کے فن پر جمالیاتی اور تاثراتی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی ہے۔ نویں باب میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کے تعلق سے مختلف ناقدین ادب کی آرا کو یکجا کیا ہے جن کے مطالعے سے مرزا کی ادبی انفرادیت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ کتاب کے آخر میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کا ایک شاہ کار افسانہ ''انگوٹھی کی مصیبت'' دعوت مطالعہ دیتا ہے۔ مختصراً یہ کہ ڈاکٹر ہارون ایوب کی یہ کوشش اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے ایک مختصر مگر جامع کتاب ہے۔

اتر پردیش کے لوک گیت
مصنف: اظہر علی فاروقی
صفحات: 632، قیمت: -/120 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔110066
مبصر: محمد عمر رضا، E-224، مہاندی ہوسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔67

یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ حصۂ اول میں لوک گیت کا عمومی جائزہ پیش کیا گیا ہے جس کے لیے مصنف نے لوک گیت کی تعریف، لوک گیتوں کی تخلیق اور قدامت، لوک گیت اور شاعری، لوک گیت کے امتیازی اوصاف، زبان، لوک گیتوں کے افراد (ساس، بہو، نند، جٹھانی، دیورانی اور دیگر مردانہ افراد)، لوک گیتوں کی اہمیت، مستقبل، لوک گیتوں کے موسیقی آلات اور جغرافیائی ماحول کے علاوہ لوک گیتوں پر سیاسی حالات و حادثات کے اثر پر روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں لوک گیتوں میں 1857 کے حالات اور اس کے بعد کی صورت حال کو کس انداز میں پیش کیا ہے، اس موضوع پر بھی مصنف نے مدلل بحث کی ہے۔ مزید برآں لوک گیتوں کا لسانیاتی جائزہ پیش کیا ہے جس کے تحت اتر پردیش کی زبان اور اس کی بولیوں کا مختصر تعارف پیش کر کے قارئین کے ذہن میں لوک گیتوں کی مذہبی، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

دوسرا حصہ ''طرز معاشرت'' ہے۔ اس میں اتر پردیش کے رہن سہن، کھانے پینے کے لوازمات، رسومات، مذہبی عقائد اور وہاں کی تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اور یہ بھی وضاحت کی ہے کہ کون سی رسم کس طرح وجود میں آئی اور اس میں کس طرح کی باتیں رائج ہیں۔

تیسرا حصہ تقریباتی گیتوں پر مشتمل ہے۔ اس میں دُوہد، زچہ گریاں، لوریاں، خدائی رات اور رت جگا، شادیانے، گالیاں، مذہبی یا نیم مذہبی گیت، لاونی، عوامی شاعری، موسمی گیت اور بارہ ماسہ کی شان نزول اور اس کے بعض نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

چوتھا حصہ پیشہ ور ذاتوں کے گیتوں پر مشتمل ہے۔ اس میں گدیوں کے جھکڑے اور گیت، گھوسیوں کے گیت (برہا)، دفالیوں، مجاوروں اور دھوبیوں کے گیتوں کی تفصیلات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ سید سالار مسعود غازیؒ کی تاریخی حیثیت، بہرائچ کا میلہ اور اس کے تاریخی حالات بیان کیے گئے ہیں۔

کتاب کے مطالعے سے اتر پردیش میں لوک گیتوں کا پس منظر، ہندوستان میں ان کا تاریخی ارتقا اور یہاں کی تہذیبی و ثقافتی رنگا رنگیوں میں لوک گیتوں کی اہمیت سے قارئین کو واقفیت ہو جاتی ہے۔ اس طرح ثقافتی نقطۂ نظر سے بھی اس کتاب کی اہمیت ہے جو اسکالر لوک گیتوں کے حوالے سے تحقیق کرنے کے خواہاں ہیں، ان کے لیے اس کتاب کی اہمیت ایک حوالے سے کم نہیں۔

خدا باقی رہے (شعری مجموعہ)
شاعر: ممتاز راشد
صفحات: 187، قیمت: -/200 روپے
تقسیم کار: ماہنامہ گل بوٹے، رحمن کمپاؤنڈ، روم نمبر۔1، اسٹیشن روڈ، بائیکلہ (ویسٹ) ممبئی۔400011
مبصر: محمد شاہد پٹھان، 22ٹی.آر. راجستھان یونیورسٹی کیمپس، جے پور۔302004 (راجستھان)

''خدا باقی رہے'' ممتاز راشد کا دوسرا شعری مجموعہ ہے، جو بیک وقت اردو اور دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوا ہے اس میں 77 غزلیات اور 429 اشعار ہیں۔ شروع کے 28 صفحوں پر فہرست غزلیات کے علاوہ ندا فاضلی، ڈاکٹر قاسم امام، وارث علوی، فضیل جعفری، بانی، اخلاق اثر حمیدی اور سلمیٰ صدیقی کے تاثرات شامل ہیں۔ 31ویں صفحے سے اصل شعری متن شروع ہوتا ہے جو صفحہ 186 تک محیط ہے، ان میں سے 80 صفحات اردو کے لیے اور بقیہ ہندی کے لیے مختص ہیں۔

وقت مایوسی ہے کوئی آسرا باقی رہے
یہ دعا ہے آسمانوں پر خدا باقی رہے

ممتاز راشد نے اسی شعر سے اپنے شعری مجموعے کا نام تجویز کیا اور اسے مجموعے میں سب سے پہلے درج کیا ہے۔ مجموعے کے اول صفحے پر ''ہر چیز کا مقدر فنا ہے، صرف خدا کی ذات کو بقا ہے'' (قرآن کے حوالے سے) اور ایک حدیث نبوی'' شاعری حکمت اور دانائی ہے، بیان جادوگری ہے'' نقل کی ہے۔ مادی حسن و عشق کی ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کے موثر اظہار کو راشد کی شاعری میں خاص مقام حاصل ہے، انھوں نے انسانی فطری جذبات و احساسات کو جمالیاتی فضا میں متغزلانہ آہنگ عطا کیا ہے، جمالیاتی ذوق چوں کہ ہر صحت مند فرد و معاشرے میں قدرتی طور پر موجود ہوتا ہے، چنانچہ راشد کی تغزل آمیز شاعری ہمیں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، بطور مثال چند اشعار ملاحظہ کریں۔

وہ ایک شخص کہ جو مثل زندگی ٹھہرا
سمجھ میں آئیں ابھی تک نہ عادتیں اس کی

کبھی مائل بہ رفاقت، کبھی مائل بہ گریز
زندگی ہم سے ملی تیری اداؤں کی طرح
تیری باتیں میری کہانی کہنے والا کوئی نہیں
شہر میں خالی دیواریں ہیں، رہنے والا کوئی نہیں
کیسے جے گی شاخِ تمنا پہ غم کی دھول
اس کے بدن پہ میری وفا کا لباس ہے

صارفیت اور خود پروری کے دور میں سماجیات اور اخلاقیات کے آداب کی قدر و منزلت کا احساس بتدریج ختم ہوتا جارہا ہے۔ ممتاز راشد نے اس نئی تہذیب و معاشرت کی ''ارزانی'' کو خود جھیلا ہے۔— ''میرے یہاں لکھنے کا عمل مشاقی سے نہیں، سماج اور میرے اندر کے فرد کی مسلسل ناچاقی کی دین ہے، میں نے وہی لکھا ہے جس کے لکھنے کے لیے طبیعت نے مجبور کیا ہے......تخلیق سے تخلیق کار کا رشتہ تخلیقی عمل تک قائم رہتا ہے اور اس کے بعد یہ رشتہ معاشرے کی طرح لامحدود ہو جاتا ہے(''خدا باقی رہے'' صفحہ 13)

ممتاز راشد کی شاعری ہر سنجیدہ قاری کو جہاں وجودی اور داخلی سطح پر متاثر کرتی ہے وہیں آج کے جدید معاشرے کی بیگانہ روی، بے حسی، بے چہرگی اور بے اعتدالیوں کی بڑھتی ہوئی مکروہات سے بھی باخبر کرتی ہے۔ یہ چند اشعار دیکھیں:

شہر کی رونقوں سے یقیں اٹھ گیا
اپنے سایے کو خود سے جدا دیکھ کر
زندگی پر یقیں کتنا کم ہو گیا
لوگ رکتے نہیں حادثہ دیکھ کر

میرا مجھ سے کیا رشتہ ہے، ہر اک رشتہ بھول گیا
اتنے آئینے دیکھے ہیں، اپنا چہرہ بھول گیا
جن سے دل میں رونق تھی وہ سب ساتھی کس دیس گئے
کس سے پوچھیں، کون بتائے کہنے والا کوئی نہیں

ممتاز راشد کی شاعری میں نغمگی، شعریت، تازگی فکر اور اسلوب میں دل نشینی کی کیفیت ہے۔ غزل کا شاعر اپنے مجموعوں کی کثرت سے نہیں بلکہ اپنی چند غزلوں اور اشعار کی نزہت و تمازت کی بنیاد پر زندہ رہتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ راشد کے یہاں ایسی غزلیں اور اشعار موجود ہیں۔

شعور و ادراک
مصنف: محمد ایوب واقف
صفحات: 312، قیمت-/250 روپے
ناشر: فاس کمپیوٹر اکس، 37، چوکی تلیا، بھوپال۔ 462001
مبصر: مشکور معینی، 266، پیریار ہاسٹل، جے۔این۔یو، نئی دہلی۔ 110067

''شعور و ادراک'' محمد ایوب واقف کے اٹھارہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ''شعور و ادراک'' کا یہ دوسرا اڈیشن ہے جس میں پانچ اضافی مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب 1991 میں پہلی بار شائع ہوئی تھی جس میں کل تیرہ مضامین تھے۔ کتاب میں جن ادبی شخصیات اور موضوعات کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے ان میں ''خواجہ حسن نظامی اور ان کی آپ بیتی، ''شبلی نعمانی اور موازنۂ انیس و دبیر''، ''کرشن چندر کا فن''، ''اردو شعر و ادب کا سردار'' اور ''منفرد لب و لہجہ کا خوبصورت شاعر— قتیل شفائی'' شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ''اردو کا ایک نایاب مرثیہ، اندراوت اور اس کا مصنف محمد قلی قطب شاہ''، ''ایشیا کی عظیم بیٹی— قرۃ العین حیدر''، ''اردو اور ہندی کا مسئلہ''، ''جوش ملیح آبادی اور اختر الایمان سے دو ادبی ملاقاتیں'' ہیں۔

اندراوت ایک منظوم داستان ہے۔ اردو شعر و ادب میں منظوم داستان کو مثنوی یا طویل نظم کہا جاتا ہے۔ اندراوت ایک مثنوی ہے جس کے خالق نور محمد شاہ کامیاب جونپوری ہیں۔ نور محمد شاہ کامیاب جونپوری ایک صوفی شاعر تھے جو اٹھارھویں صدی کے اواخر میں اردو شاعری کے افق پر نمودار ہوئے تھے۔ ان کی یہ مثنوی ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ محقق کے پاس جو نسخہ موجود ہے وہ قلمی صورت میں ہے۔

''اردو اور ہندی کا مسئلہ'' کے تحت صاحب مضمون نے فکر انگیز باتیں کہی ہیں۔ ''ایشیا کی عظیم بیٹی— قرۃ العین حیدر'' میں یہ انکشاف کیا ہے کہ پاکستان میں اقبال کے بعد قرۃ العین حیدر کو سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ ''اختر الایمان سے دو ادبی ملاقاتیں'' میں اختر الایمان کی شاعری پر گفتگو کی گئی ہے۔ جس کے مطالعے سے بیک وقت اختر الایمان کی شاعری، شخصیت اور نئی شاعری کی لفظیات سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ''کرشن چندر کا فن'' بھی ایک جامع مضمون ہے۔

''اردو شعر و ادب کا سردار'' علی سردار جعفری کی وفات پر لکھا گیا ایک مختصر تاثراتی مضمون ہے۔ 'منفرد لب و لہجہ کا شاعر— قتیل شفائی' قتیل شفائی کی غزل گوئی پر ایک عمدہ مضمون ہے۔

اداس لمحوں کے موسم (شعری مجموعہ) / فاروق بخشی
صفحات: 114، قیمت: -/150 روپے
تقسیم کار: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔110002
مبصر: خسرو متین، کے۔52 بٹلہ ہاؤس، اوکھلا، نئی دہلی۔110025

''اداس لمحوں کے موسم'' فاروق بخشی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل ان کا پہلا شعری مجموعہ 1980 میں ''پلکوں کے سائے'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ فاروق بخشی کا تعلق اس نسل سے ہے جس نے گذشتہ صدی کی آٹھویں دہائی کے آغاز میں شعر کہنا شروع کیا اور جلد ہی اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ فاروق بخشی کے یہاں غزل اپنے تمام بنیادی عناصر اور نئی لفظیات و افکار کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

نہ چاند چہرے کو، پلکوں کو شبنمی لکھنا
غزل لکھو تو کوئی بات بھی نئی لکھنا

میں روز گھر سے یہی سوچ کر نکلتا ہوں
مری تلاش کو شاید سکون مل جائے

لکھ رہی ہے دھوپ میرے جسم پر اپنی کتاب
سب پڑھیں گے شوق سے جس کو وہی قصہ ہوں میں

فاروق بخشی صرف نرم و نازک جذبوں کی ہی شاعری نہیں کرتے بلکہ انھوں نے ارضی حقیقت کی سنگلاخ زمین پر ننگے پاؤں قدم بڑھایا ہے۔ وہ راستے کے مسائل سے صرف نگاہ نہیں کرتے بلکہ جواں سال سپاہی کی طرح اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ دو اشعار ملاحظہ کریں:

اب کسی منصف کا اپنی سوچ پر قابو نہیں
میرے حق میں یہ گواہی، یہ بیاں اپنی جگہ

آج پھر اخبار میں امن و سکوں کی بات ہے
شہر کی گلیوں میں یہ اٹھتا دھواں اپنی جگہ

''اداس لمحوں کے موسم'' کے خالق کے یہاں فکر و جذبات کا ایک حسین امتزاج ہے۔ امید کہ ان کا یہ شعری مجموعہ قبول عام کا درج حاصل کر سکے گا۔

ماہنامہ ''تمثیل نو'' رشمارہ 4-3، جلد۔6
مدیر اعزازی: ڈاکٹر امام اعظم ر صفحات: 208، قیمت: -/25 روپے
پتہ: قلعہ گھاٹ، دربھنگہ، 846004 (بہار)
مبصر: فیروز عالم، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد (اے۔ پی۔)

''تمثیل نو'' کے زیر نظر شمارے میں متھلا کی علمی، ادبی، لسانی، تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کے علاوہ موجودہ صورت حال کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ابتدا میں تاثرات کے زیر عنوان دربھنگہ سے متعلق مختلف قلم کاروں کی یادوں کو جگہ دی گئی ہے جس سے نہ صرف وہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے روایتی اور بڑے مراکز سے دور چھوٹی چھوٹی جگہوں پر بھی اس زبان کے چاہنے والے کتنی تندہی اور محبت سے اس کی خدمت میں مصروف ہیں اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشاں ہیں۔ اس حصے میں پروفیسر سید منظر امام، ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری اور تشنہ اعجاز کے مضامین شامل ہیں۔

حسن امام درد نے اپنے تحقیقی مضمون ''متھلا اور ادب (1946 تک)'' میں متھلا کی ادبی تاریخ کا مختصر مگر جامع احاطہ کیا ہے جس میں اردو کے علاوہ سنسکرت، فارسی، ہندی اور میتھلی کے علما اور مشاہیر کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ منظر شہاب نے اپنے مضمون ''ودیا پتی: میتھلی ادب کا عظیم فنکار'' میں میتھلی اور سنسکرت کے اس عظیم شاعر کے حالات زندگی اور شاعری کا تعارف پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر رئیس انور نے ''دربھنگہ: اردو کا ایک اہم مرکز'' میں گذشتہ پچاس برسوں کی ادبی اور شعری تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ متھلا یونیورسٹی (شعبۂ اردو) میں پی ایچ. ڈی. کی ڈگری کے لیے لکھے جانے والے مقالوں کے عنوانات کے علاوہ مقالہ نگاروں اور نگراں حضرات کے نام اور سال بھی درج کیے ہیں۔ ڈاکٹر منصور عمر نے ''متھلا میں اردو شاعری'' ڈاکٹر امام اعظم نے ''متھلا میں اردو صحافت'' اور ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے ''متھلا میں اردو افسانے'' کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ منظر سلیمان کا مضمون اردو اور میتھلی کے باہمی رشتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس شمارے کے دیگر مضامین میں ''متھلا کی تاریخی اور تہذیبی روایت کا امین —— مدھوبنی'' از مجیر احمد آزاد، ''پیغمبر پور اسٹیٹ کی ادبی اور ثقافتی خدمات'' از سید محمود احمد کریمی، ''علی نگر کی علمی و ادبی سرگرمیاں'' از غلام فرید، ''ململ اور بابہت کی ادبی، تہذیبی اور سیاسی خدمات'' از نیاز احمد، ''متھلا کی ایک بستی ہرسنگھ پور کی مذہبی اور علمی شخصیتیں'' از ڈاکٹر ایم. صلاح الدین، ''ادب و تہذیب اور علم و عرفان کا مرکز: گنگوارہ'' از ڈاکٹر ایم صلاح الدین، ''دربھنگہ کا محرم'' از حسن امام درد، ''چندن پٹی ایک تعارف'' از مجیر احمد آزاد، ''دربھنگہ کے مسلم وکلا اور اطبا'' از ڈاکٹر آفتاب اشرف، ''نواب بر پول: ایک استعارہ'' از ڈاکٹر انیس صدری شامل ہیں۔

اس خصوصی شمارے میں مستقل کالموں کے تحت غزلیں، نظمیں اور افسانوں کے علاوہ کتابوں پر تبصرے بھی شامل ہیں۔ یہ شمارہ متھلا کی علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی تاریخ سے متعلق ایک دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔

□□□

خسرو متین

بہادر مینڈک

سونو خرگوش شام کو جب اپنے گھر واپس آیا تو دروازے میں قدم رکھتے ہی اسے ایک دہشت ناک آواز سنائی دی—

''خبردار! اندر آنے کی کوشش مت کرنا۔ میں جنگل کا بادشاہ ہوں۔ میں شیر چیتوں کو اپنے قدموں تلے کچلتا ہوا چلتا ہوں۔ ہاتھی کی دُم کو پکڑ کر اچھال دیتا ہوں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں یہاں کچھ دن آرام کرنے آیا ہوں۔ مجھے شور شرابہ بالکل پسند نہیں۔ میں خود ہی دو تین دن بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ سمجھے!''

اس دہشت ناک آواز کو سن کر سونو خرگوش بری طرح ڈر گیا۔ اس نے سوچا جس کی آواز اتنی خوفناک ہے وہ خود کتنا طاقت ور ہوگا۔ میں یقیناً اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مجھے کسی کی مدد لینی چاہیے۔ وہ مدد کے لیے اپنی دوست لومڑی کے پاس پہنچا اور سارا واقعہ سنایا۔

لومڑی نے ساری بات سن کر بڑی چالاکی سے جواب دیا:

سونو بھائی! تم تو جانتے ہی ہو میں بوڑھی ہو چکی ہوں اور اس خبیث جانور کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ جنگل کے راجہ شیر کے بعد چیتا سب سے زیادہ طاقتور اور پھرتیلا جانور ہے۔ آؤ! چلیں۔ چیتے کے پاس چلتے ہیں۔''

سونو خرگوش اور بوڑھی لومڑی چیتے کے پاس پہنچے۔ لومڑی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا:

''حضور! اس غریب خرگوش کے گھر میں کوئی خبیث جانور قابض ہوگیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو جنگل کا بادشاہ کہتا ہے۔ آپ بڑے ہی رحم دل اور بہادر واقع ہوئے ہیں۔ برائے مہربانی اس کی مدد کیجیے۔''

چیتا لومڑی کی چکنی چپڑی باتیں سن کر ان کے ساتھ جانے کو تیار ہوگیا۔ وہ تینوں خرگوش کے گھر پہنچے۔ جیسے ہی چیتے نے سونو کے گھر میں قدم رکھا وہی خوفناک آواز سنائی دی۔

''اے چیتے! کیا تجھے اپنی جان پیاری نہیں؟ اندر مت آنا ورنہ پچھتائے گا۔ ویسے بھی مجھے چیتے کا گوشت بہت پسند ہے۔''

چیتے نے جب یہ خوفناک آواز سنی تو وہاں سے دُم دبا کر بھاگ گیا۔ لومڑی بھی اپنی طبیعت کے خراب ہونے کا بہانہ بنا کر وہاں

سے کھسک لی۔ سونو خرگوش سوچنے لگا، اب کیا کروں؟ اس نے سوچا مجھے ہاتھی دادا کے پاس چلنا چاہیے۔ وہ جنگل کا سب سے بڑا اور طاقتور جانور ہے وہ ضرور میری مدد کرے گا۔

سونو ہاتھی کے پاس پہنچا اور ہاتھ جوڑ کر بڑی انکساری سے بولا:

''حضور والا! میری مدد کیجیے۔ ایک بدمعاش جانور میرے گھر میں گھس آیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو جنگل کا بادشاہ کہتا ہے۔ میں نے جب آپ کے پاس جانے کی دھمکی دی تو اس نے آپ کا بھی خوب مذاق اڑایا۔ وہ کہتا ہے۔ ہاتھی میرے آگے کیا چیز ہے؟ میں اس کی دم پکڑ کر اچھال سکتا ہوں۔''

سونو خرگوش نے سوچا اس طرح ہاتھی کو غصہ آجائے گا اور وہ میرے ساتھ چل دے گا، مگر ہاتھی سونو خرگوش کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا اور اس نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑالی:

''اس وقت تو میں اپنے ایک بیمار دوست کو دیکھنے اسپتال جا رہا ہوں۔ واپس آنے پر دیکھوں گا۔''

مایوس سونو خرگوش روتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ گھر کے باہر بیٹھ کر زور زور سے رونے لگا۔ ایک مینڈک سونو کے گھر کے قریب بیٹھا ہوا سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ وہ سونو خرگوش کے پاس گیا اور بولا:

''سونو بھائی! رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمت سے کام لو۔ تم نے اس بدمعاش جانور کی صرف آواز سنی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اتنا طاقتور اور بہادر نہ ہو جتنا وہ اپنے آپ کو بتا رہا ہے یا تم سمجھ رہے ہو۔''

یہ کہہ کر مینڈک سونو کے گھر میں گھس گیا۔ وہی خوفناک آواز پھر سنائی دی۔

''اے بے وقوف مینڈک! اندر مت آنا۔ ورنہ اپنی جان سے جاؤ گے۔ واپس لوٹ جاؤ۔''

مینڈک اس آواز کو سن کر ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوا اور آگے بڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد مینڈک ایک چھوٹے سے کیڑے کو پکڑ کر باہر لایا اور سونو خرگوش سے بولا:

''سونو بھائی! دیکھ لو یہ ہے وہ خبیث کیڑا جو اپنے آپ کو جنگل کا بادشاہ بتا رہا تھا۔''

اس ننھے سے کیڑے کو دیکھ کر روتا ہوا سونو بھی ہنس پڑا۔

(افریقی لوک کتھا)

□□□

پتہ:

K-52, Batla House
Okhla, New Delhi-110025

سیما برمن

محبت کی زبان

بچوں کی کہانیوں میں جانور اور چرند و پرند انسانوں سے گفتگو کرتے ہیں اور شر کے خلاف جنگ میں خیر کی مدد کرتے ہیں۔ بچوں کے ذہن میں بھی جانوروں کی یہی تصویر ابھرتی ہے مثلاً شرارتی چوہا، تیز رفتار ہرن، دھیمی رفتار والا کچھوا، باتونی گھوڑا، حیرت انگیز مکڑی، لڑاکو مرغی، چالاک بلی، فریبی لومڑی، گھمنڈی مور، بدصورت کوا اور بھرّانے والا مینڈک وغیرہ۔ کبھی کبھی انسان جانوروں کے خلاف نہایت ظالمانہ رویہ اختیار کرتا ہے اور کبھی رحم دلانہ۔ کولکاتا کے 'بیلور مٹھ' میں سوامی وویکانند اپنے کتے، بکری، ہرن، سارس، گائے، بھیڑ اور بطخوں وغیرہ کے ساتھ ایک چھوٹے بچے کی طرح رہتے تھے۔

رام کرشن پرم ہنس کو دکشنیشور مندر کے باغ میں رہنے والے ایک کتے سے انسیت تھی۔ وہ اس کتے کو کیپٹن کے نام سے پکارتے تھے اور وہ کتا زیادہ تر 'کالی ماں' کے مندر کے سامنے والے چبوترے پر ہی بیٹھا رہتا تھا۔ کیپٹن، رام کرشن پرم ہنس کا بہت وفادار تھا: ''کیپٹن اپنے کرم کی وجہ سے ایک کتے کی شکل میں پیدا ہوا ہے۔ پچھلے جنم میں اس کے اندر جو چند خوبیاں تھیں، انھی کی وجہ سے وہ یہاں مندر میں ہے اور اس کے اندر ایک اچھی روح موجود ہے۔''

جو لوگ چرند و پرند کے کھانے اور ان کی ضرورتوں کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں، وہ ان سے محبت کی زبان میں گفتگو کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ دلّی کی ایک اسکول ٹیچر در بدر بھٹکنے والے کم از کم 20 کتوں کو روزانہ اپنی نگرانی میں کھانا کھلاتی ہے۔ ایک رات وہ ایک کتے کے پلّے (بچے) کو مصروف چوراہے سے اٹھا کر محفوظ مقام پر لے گئی۔ پلّے کی ماں (کتیا) اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں پہنچی اور اپنے بچّے کی حفاظت کے لیے اس نے ٹیچر کو کاٹ لیا۔ اس کے باوجود ٹیچر نے ان دونوں کو کھلانے پلانے کے بعد ہی اسپتال کا رخ کیا۔

شکار اور قربانی کے نام پر جانوروں کے خلاف جہاں ایک طرف ظالمانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے وہیں دوسری طرف مہاتما گوتم بدھ جانوروں سے محبت کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ ایک روز مہاتما گوتم بدھ کے چچازاد بھائی نے ایک چڑیا کا شکار کیا جو اتفاقاً مہاتما گوتم

بدھ کی گود میں آ گری۔ مہاتما گوتم بدھ نے اس زخمی چڑیا کو اپنے چچازاد بھائی کے حوالے نہیں کیا اور اس سے کہا کہ وہ چاہے تو بدلے میں ان کا گوشت کھالے۔ دونوں کے درمیان ہونے والے اس جھگڑے کی خبر جب راج گرو کو ہوئی تو انھوں نے مہاتما گوتم بدھ کے حق میں فیصلہ سنایا۔

رمنا مہارشی اپنے آشرم میں موجود جملہ جانوروں کی موجودگی میں اپنے کرموں کا اظہار کرتے تھے۔ جانوروں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ اس کے بعد ہی آشرم میں رہنے والے دیگر افراد اور خود مہارشی کھانا کھاتے تھے۔ تری ونت پورم میں مہارشی کا آشرم آج بھی موروں، بندروں، کتوں، بلیوں اور چڑیوں کا آشیانہ ہے جہاں پر یہ سب ایک ساتھ سکون سے رہتے ہیں۔ وہاں پر جیکی (کتا)، لکشمی (گائے)، ایک بے نام کوا اور والی (ہرن) کی یاد میں مہارشی کے ہاتھوں بنائی گئی یادگار مورتیوں کو آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

جیکی (کتا) اس وقت تک کھانا نہیں کھاتا تھا جب تک مہارشی اپنے ہاتھوں سے اس کے منہ میں نوالا نہ ڈالتے تھے۔ جب لکشمی (گائے) شدید بیمار تھی تب مہارشی اس کے پاس ایک گھنٹے تک بیٹھ کر اسے تسلی دیتے رہے۔ مہارشی نے لکشمی (گائے) سے کہا ''اماں لکشمی مجھے اب دربار میں جانا چاہیے کیوں کہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے لیکن میں جہاں بھی رہوں گا تمھیں نہیں بھولوں گا۔ میں ہمیشہ تمھارے ساتھ ہی رہوں گا۔ بعد میں مہارشی نے یہ اعلان کیا کہ لکشمی نے زندگی سے آزادی حاصل کر لی ہے۔ والی (مادہ ہرن) پر کسی نے حملہ کیا اور وہ نہیں بچ سکی۔ ان آخری لمحات میں مہارشی اپنا ایک ہاتھ اس کے سر پر اور ایک ہاتھ اس کے دل پر رکھ کر اس کے ساتھ رہے۔ رام کرشن پرم ہنس، وویکانند، رمنا مہارشی اور اس طرح کی دیگر شخصیات نے اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہمدردی اور رحم دلی کا جذبہ ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ بلاشبہ محبت ایک آفاقی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

(بشکریہ ''ٹائمس آف انڈیا'' 20 جنوری 2007)

□□□

تلخیص و ترجمہ — مشرف علی

343, Jhelum Hostel
JNU, New Delhi-110067

بائیں سے جناب ایس موہن، سابق ڈائرکٹر انچارج، این بی. پی. یو. ایل.، جناب پرویز شہریار، پرنسپل پبلیکیشن آفیسر، این بی. پی. یو. ایل.، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر کلیم اللہ۔
پیچھے کونسل کے عملے کے ارکان میں جناب شہنواز محمد خرم، محترمہ شمع کوثر یزدانی اور جناب ڈی. آر. راجا۔

کونسل کی نشست کے شرکا میں بائیں سے پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، جناب اقبال مجید، جناب زبیر رضوی، جناب قسیم حنفی،
جناب شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر قمر رئیس اور جناب پرویز شہریار، نشست کے اختتام پر۔

RNI No. 70323/99
[illegible]-15/4104/2006-08
Date of Publication : 24/03/2007

URDU DUNIYA Monthly, April 2007, Vol. 9, Issue: 4
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

"فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوتِ فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظرِ عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نا معلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

[illegible] سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی [illegible]ں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	[illegible]
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	[illegible]
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	[illegible]
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	[illegible]	[illegible]
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	[illegible]	[illegible]

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک: 8، ونگ: 7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066

Printed and Published by Rashmi Chowdhary, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Rashmi Chowdhary, Tel : 26103381, 26103938